انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲، دادابھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تا حال ڈائرکٹران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۴۷ سے ۱۹۶۸ء)
پروفیسر سید ظہیرالدین مدنی (۱۹۶۹ سے ۱۹۷۴ء)
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷۵ سے جاری)

• •

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کمیٹی

چیئرمین

جناب مصطفیٰ فقیہ

•

اراکین

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا — جناب عبدالمجید پالکا،
پروفیسر عبدالقادر قاضی

•

سیکرٹری

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

• •

انجمن اسلام کی مجلس عاملہ

صدر

جناب معین الدین حارث

•

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب مصطفیٰ فقیہ	محترمہ ہمایے پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی
اعزازی جنرل سیکرٹری		جائنٹ سیکرٹری و خازن
جناب عبدالمجید پالکا		جناب یوسف مراد

•

اراکین

محترمہ زبیدہ کریم بھائی — محترمہ زلیخا مرچنٹ

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا

جناب مامون لقمانی — جناب ہاشم اسماعیل

جناب فیض حسن والا — جناب عبدالستار عمر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

۳۴

جلد ۳۴ ۰ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۸۳ع

مندرجات

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر نجیب اشرف ندوی
- لغات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنمائے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی
- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- غزل ولی تک (مولفہ)
- اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین گوریکر
- اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
- نوائے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
- طوطیاں ہند (مرتبہ)
- انڈو ایران ریلیشنز۔ کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)

عبدالرزاق قریشی
- نوائے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- راگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے (مصنفہ) ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی (مرتبہ) ڈاکٹر حامداللہ ندوی

مقالہ نما (مرتبہ) رقیہ اسمادار

پروفیسر ایم کلیم سہسرامی
راجشاہی یونیورسٹی، ڈھاکہ (بنگلا دیش)

ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال کی آپ بیتی

[ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال سنہ ۱۸۷۸ع میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور دسمبر ۱۹۳۴ع میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اردو کے مشہور شاعر شاد عظیم آبادی کے بھانجے تھے۔ بنگال کے سرسید نواب بہادر عبداللطیف فریدپوری، جسٹس سید امیر علی اور نواب بہادر سید امیر حسین بھاگلپوری نے ان کی علمی، سماجی اور سیاسی تحریکوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۱۹۰۶ع میں خیال ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر اور ۱۹۰۸ع میں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے اور ۱۹۱۶ع میں انہوں نے اُردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی۔ یہ خطبۂ صدارت «داستان اُردو» کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ نواب نصیر حسین خیال نے اور بھی بہت سارے مضامین اپنے اور فرضی ناموں سے مختلف رسائل و جرائد میں لکھے ہیں۔ ان کے طرز تحریر میں شعریت، لطافت اور رنگینی کے ساتھ حسن خیال اور لطف زبان بھی پایا جاتا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خیال نے نثر میں شاعری کی ہے۔ محمد حسین آزاد جیسا رنگین اور لطیف اسلوب نثر بہار کے تین ادیبوں میں پایا جاتا ہے۔ (۱) شاد عظیم آبادی کے بھانجے نواب نصیر حسین خیال (۲) صفیر بلگرامی کے پوتے سید وصی احمد بلگرامی اور (۳) پرویز شاہدی کے سگے ماموں پروفیسر سید عبدالصمد صبا رشیدی، مدیر ماہنامہ «فطرت» ہندوپاک کے تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں اب تک ان جیسے ادیبوں پر کوئی کام نہیں ہوا ہے خصوصاً بہار کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ کی توجہ میں اس مضمون کے ذریعہ منعطف کرانا چاہتا ہوں کیوں کہ ان ادیبوں کی ادبی خدمات کا فرض حتماً ان پر عائد ہوتا ہے کسی اور پر نہیں

پچھلے چند برسوں سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں کچھ ایسے قلمی نسخے، بیاضیں اور منتشر کاغذات جمع ہوگئے ہیں جن کی فہرست اتنک مرتب نہ ہوسکی اس ذخیرے کے مطالعے کے سلسلے میں کچھ ایسے منتشر کاغذات دستیاب ہوئے ہیں جو غالباً رسالہ « جادو » ڈھاکہ (مجریہ ۱۹۲۴ع) کے ایڈیٹر شفاءالملک حکیم حبیب الرحمن مرحوم کو اشاعت کیلئے بھیجے گئے تھے۔ انھیں کی مدد سے ذیل کے دو مضامین مرتب کئے گئے ہیں جو حکیم صاحب کے صاحبزادے نے ڈھاکہ یونیورسٹی کو عطیہ کے طور پر دیدئے ہیں (کلیم سہسرامی)۔]

آپ بیتی

عظیم آباد سے ہم نے ادیب نامی ایک ماہوار ادبی رسالا نکالا، جس کی نسبت مولوی عبدالحلیم شررکے جیسے اردو کے استاد نے اپنے مشہور رسالا « دلگداز » میں تحریر کیا تھا کہ « یہ رسالا (ادیب) عظیم آباد کو بہت جلد اردو کا ایک تیسرا مرکز (دلی اور لکھنو کی طرح) بنا دے گا! » اور سرسید نے تحریر فرمایا تھاکہ « اس رسالہ کی اردو قابلِ مدح و تقلید ہے! » افسوس کہ یہ رسالہ بہت کم دن زندہ رہا، اس کے روح رواں، مولوی سید علی سجاد مرحوم (صاحب محل خاصہ) حیدرآباد چلے گئے اور اس کے بعد ہی ہماری شادی کلکتہ میں ہوگئی اور اسے بند کردینا پڑا۔ اردو ادب کا یہ شوق اسی وقت سے اس وقت تک ایک طرح قائم رہا اور اب ہمارا واقعی اگر کوئی مشغلہ اور بہترین پاس ٹائم ہے تو یہی اردو!

شادی

سنہ ۱۸۹۷ع یعنی جب کہ میری عمر ۱۹ برس کی تھی، کلکتہ (مٹیا برج) کے ایک مشہور و خوش حال خاندان میں میری شادی ہوگئی۔ میری بی بی کنیز ام سلمہ نواب انتظام الدولہ مرزا بیگ کی بیٹی تھیں انھوں نے ۱۹۲۲ع میں قضا کی، ہمارا ان کا ساتھ ۲۵ برس رہا، ہمارے ان کے تعلقات معمولی زن و شو سے بہت زیادہ یعنی عاشقانہ و معشوقانہ تھے، انھوں نے اپنی خوشی کو میری خوشی و مرضی پر ہمیشہ قربان کیا، ہمارے ان کے بیچ کبھی اختلاف نہیں ہوا، ہم نے ان کی سی نیک اور

شریف بی بی نہیں دیکھی ، اللھم اغفر ہا ! میری بی بی کی ایک بہن ، کنیز مریم خاتون تھیں ، وہ میری شادی کے بعد ہی سولہ برس کی عمر میں بیوہ ہوگئیں ، اس وقت سے ۱۹۱۸ء تک یعنی تقریباً بیس برس وہ میرے ساتھ رہیں ، میری ان کی الفت و محبت غیر معمولی اور ضرب المثل ہوگئی تھی ، ہم نے ان کی سی مضبوط اور مستقل مزاج اور بہادر بی بی نہیں دیکھی ، انہوں نے ۱۹۱۸ء میں قضا کی اور مجھے نیم جاں چھوڑ گئیں ، انا للہ !

میرے سالے ، مرزا عسکر احمد بیگ اور مرزا عباس احمد بیگ ، کلکتہ کے سے شہر میں مشہور اور بہت ہر دل عزیز تھے یہ دونوں بھائی ، اخلاق و آداب اور سیر چشمی و مروت میں آپ اپنی نظیر اور ایک بڑے گھر کے رکن معلوم ہوتے تھے. مرزا عباس احمد نے ۱۹۱۲ء میں اور مرزا عسکر احمد نے ۱۹۱۵ء میں وفات پائی اور افسوس کہ ان کے مرتے ہی وہ خاندان ہر اعتبار سے مٹ گیا اور مر گیا !

کلکتہ میں قیام

اس شادی کی وجہ سے عظیم آباد کو اجاڑ کر مجھے کلکتہ کو بسانا پڑا اور ۱۹۰۰ء سے اب میرا مستقل قیام کلکتہ ہی میں ہے ، اس شہر میں ہم کو محض ایک مسافر کی طرح اور کسمپرسی کے عالم میں رہنا چاہیے تھا اس لئے کہ یہاں معدودے چند حضرات کے سوا ، میرے خاندان اور مجھ سے کوئی واقف نہ تھا مگر ایسا نہیں ہوا . حضرات کلکتہ و بنگالہ نے مجھے کبھی غیر نہیں سمجھا ، انہوں نے میرے ساتھ ہمیشہ برادرانہ سلوک کئے اور یہ التفات اس ۲۵ برس کی مدت میں نہی گھٹا نہیں بلکہ بڑھتا دکھائی دیا اور میں اس پر فخر کرتا اور ان حضرات کا دعاگو ہوں اور رہوں گا .

میں جب شروع میں کلکتہ آیا تو نواب بہادر ، نواب عبداللطیف کا زمانہ تھا اور وہ شہر کے ایک رکن سمجھے جاتے اور مسلمانوں کے سردار مانے جاتے تھے . مرحوم کے ساتھ ہمارے تعلقات خاندانی اور خردانہ و بزرگانہ تھے ان کی خدمت میں اکثر حاضری کا موقع ملتا اور مرحوم بیحد التفات فرماتے تھے . ان کے

خلف الرشید نواب عبدالرحمن (سابق جج) سے برادرانہ و عزیزانہ تعلقات رہے، ان
مرحوم کے دوسرے فرزند نواب زادہ عبداللطیف فیض کے ساتھ۔ تو وہ کشش ہے کہ
انہیں دیکھ کر غم غلط ہوتا اور دل کو آرام ملتا۔

نواب بہادر عبداللطیف کے بعد کلکتہ میں نواب بہادر سید امیر حسین کا درجہ
تھا یہ بزرگوار بہاری تھے مگر کلکتہ میں شادی کر گئے۔ ان مرحوم اور ان کے
احباب نے "محمڈن سنٹرل ایسوسی ایشن" نامی ایک انجمن، نواب بہادر عبداللطیف کی
لٹریری سوسائٹی کے مقابلے میں قائم کی تھی ان دونوں نامی انجمنوں کے بہ کثرت
ممبر اور ہر طبقہ کے حضرات ان کے رکن و ہوا خواہ تھے۔ ان دونوں انجمنوں میں
بظاہر کشیدگی تھی مگر یہ حضرات اس بنا پر اپنے قدیمی تعلقات کو کبھی نہیں
بھولتے اور پولیٹیکل جنگ کے بعد بھی اپنی شرافتوں کو یاد رکھتے ایک دوسرے کے
کام آتے اور آجکل کے "پولیٹیشین" کی طرح ذاتیات پر کبھی حملہ نہیں کرتے
تھے۔ مجھے دونوں طرف رسوخ اور ان دونوں جماعتوں سے ارتباط رہا نواب بہادر
امیر حسین کو بھی میں نے ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا اور انہوں نے بھی مجھے اپنا خورد جانا۔

رائٹ آنریبل مسٹر سید امیر علی، اس وقت کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے اور
اس وجہ سے گو وہ بظاہر پبلک سے الگ دکھائی دیتے تھے مگر ایسا تھا نہیں۔
ہمارے ملک کے اکثر پولیٹیکل سوشل مسائل ان کے گھر میں طے ہوتے تھے ہمارے
ان کے کچھ قرابت بھی تھی اور اس لحاظ سے ان سے ملنا ناگزیر تھا۔ ہر اتوار
کو معمولاً ان سے ملنے جاتے اور وہ بہ مہربانی پیش آتے تھے، ایک دفعہ کلکتہ
یونیورسٹی کے بعض امتحان، عشرۂ محرم میں مقرر کردئے گئے طلبا کو اس کی شکایت
ہوئی، ہم سے بھی ذکر آیا۔ رائٹ آنریبل بیمار تھے اور کئی روزوں سے ہائی کورٹ
بھی نہیں گئے تھے، ہم کو معلوم تھا مگر جرأت کرکے ہم اسی وقت ان کی خدمت
میں حاضر ہوئے، امتحان کا قصہ عرض کیا، متعجب ہوئے اور اسی وقت انہوں نے
وائس چانسلر کو فون کیا اور تاریخیں بڑھوا دیں۔ اب ہائی کورٹ کا جج تو جج، کسی
گورنر کی کونسل کا ایک ممبر بھی ایسی جرأت نہیں کرسکتا۔ سچ ہے، شخصیت
بڑی چیز ہے۔

نواب سید امیر حسین سی - آئی - ای

نواب بہادر عبداللطیف کے بعد کلکتہ میں نواب امیر حسین کا درجہ تھا ۔ یہ بزرگوار بہاری اور خاندانی تھے ۔ ابتدائے عمر میں سب رجسٹرار مقرر ہوئے ترقی کرتے کرتے اس درجے تک پہنچے جو ان کے وقت میں ہندوستانیوں کی معراج تھا ، کلکتہ میں وہ مجسٹریٹ رہے اور اس کرسی پر یوں بیٹھے کہ ان کے بعد پھر وہ بھر نہ سکی ۔ نواب صاحب نے اس آزاد شہر میں مجسٹریٹی نہیں ملکہ واقعی شاہی کی ، وہ اجلاس پر مقدمہ سنتے اور گھر پر فیصلہ سناتے تھے اور ان کے حکم سے کسی کو سرتابی کی مجال نہ تھی ۔

انھوں نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کے مقابلے میں ، محمڈن سنٹرل ایسوسی ایشن نامی ایک پولیٹکل انجمن قائم کی تھی جو ۱۹۰۸ع تک زندہ رہی آل انڈیا مسلم لیگ کے قائم ہونے کے بعد ، ایک دن سر ایڈورڈ بیکر (لفٹنٹ گورنر بنگال) نے اثنائے گفتگو میں مجھ سے پوچھا کہ بنگالہ میں لیگ کی کوئی شاخ ہے یا نہیں ؟ میں نے نفی میں جواب دیا ، وہ اس کی وجہ پوچھتے رہے اور میں کلکتہ میں اس کے قیام کی دشواریوں کو بیان کرتا رہا ، خموش ہوگئے اس ذکر کے دوسرے ہفتے میں محمڈن سنٹرل ایسوسی ایشن کا حسب معمول ایک ایڈرس ان کی خدمت میں پیش ہونے والا تھا ، میں بھی اس کی شرکت کے لئے مدعو تھا ، جس روز وہ ایڈرس پیش ہوتا ہے ۔ اس کی صبح ہی کو بہت سویرے ، کپتان رالفس ، پرائیوٹ سکتر نے مجھے اس ایڈرس اور اس کے جواب کی کاپیاں بھیجدیں ۔ لاٹ صاحب کے جواب میں درج تھا کہ - " محمڈن ایسوسی ایشن کو اب اپنا جول بدلنا اور سمجھنا چاہیے کہ مسلم لیگ کے سوا کوئی اور جماعت و انجمن مسلمانوں کی وکالت و نیابت کا حق ادا نہیں کرسکتی اس جواب کے منشا کو سمجھ کر میں اس ڈپوٹیشن میں شریک نہ ہوا اور اسکے تیسرے دن میں نے کلکتہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک شاخ قائم کردی نواب صاحب نے اس لیگ میں شرکت ہی نہیں فرمائی بلکہ موقعہ و وقت پر نظر کرکے اور مسلمانوں کے متفقہ زور کو برقرار رکھنے کی غرض سے وہ اس کے ایک رکن اعلی بھی رہے ۔

محمڈن لٹریری سوسائٹی اور یہ محمڈن ایسوسی ایشن گو بظاہر دو رقیب انجمنیں اس صوبہ میں تھیں اور ان کے ممبر بکثرت اور ہر طبقہ و درجہ کے حضرات ان کے رکن و ہوا خواہ تھے، مگر یہ بزرگوار اس بنا پر ایک دوسرے کے رقیب کبھی نہیں بنتے اور اپنے قدیمی تعلقات کو کبھی نہیں بھولتے اور پولیٹکل جنگ کے بعد بھی اپنی شرافتوں کو یاد رکھتے ایک دوسرے کے کام آتے اور آجکل کے پولیٹیشین کی طرح ذاتیات پر کبھی حملہ نہیں کرتے اور ایک دوسرے سے دست و گریبان نہیں ہوتے تھے۔

نواب صاحب کی وضع میں بھی ایک امتیاز اور شان تھی وہ ان کی مخملی گول بے کٹ کے چندوالے کی ذرا اونچی ٹوپی جس پر سارس بیل ٹنکی، ان کے سر زیب اور بلند پیشانی کے ساتھ بھرے رخساروں کو جلوہ دیتی تھی، عموماً پارسی نما ڈھیلا، گھیر دار اور گھٹنوں سے کچھ نیچا سیاہ کوٹ پہنتے تھے اور وہ ان کے بھاری بھرکم جسم پر نہایت مزیب معلوم ہوتا تھا۔ بڑی پارٹیوں یا دربار و لیوی میں جاتے تو کوٹ پر پیٹی لگا لیتے تھے اور اس سے ان کی شان دوبالا ہوجاتی تھی۔ ڈاڑھی ہمیشہ مورچہ لئے یا خشخشی رہی اور مونچھیں اوسط، اس پر مارو کا خضاب پھبتا اور بھلا لگتا۔ آواز بھاری مگر بساٹ دار و وزن دار تھی۔ سواری میں ہمیشہ جوڑی رہی اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی کہ تنخواہ نصف ہوگئی یہ جوڑی کبھی فرد نہ ہوئی! نہایت یار باش، دوست پرور اور صاحب اخلاق بزرگوار تھے پنشن کے بعد بھی کئی سال کلکتہ میں مقیم رہے اور اسی اگلی شان و دبدبہ کے ساتھ۔ اخیر میں اپنے آبائی وطن بھاگل پور چلے گئے اور وہیں مرحوم ہوئے انہوں نے اقبال حسین کا سا با اقبال فرزند چھوڑا، جسے وہ دم ہوش چاہتے اور ان کی بات بات پر فدا تھے، یہ اقبال مند الحمد للہ، حیات، خوش حال اور بہار میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔

●

پروفیسر زبیر قریشی
احمد آباد

کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے چند اردو مخطوطات

کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں جہاں عربی فارسی کے بیش بہا مخطوطات ہیں وہاں اردو کے بھی چند نادر مخطوطات ہیں۔ دو سو یا تین سو سال پرانے یہ مخطوطات گجرات کے ان شہروں میں تالیف و کتابت کئے گئے ہیں جو اس وقت علم و ثقافت کے مرکز خیال کئے جاتے تھے۔ بعض ایسے بھی ہیں جن کا تعلق گرد و نواح کے صوبوں سے ہے۔ گو یہ سب اردو رسم الخط میں ہیں تاہم مصنفین نے گجری، ہندی یا دکھنی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سب اسی عبوری زمانے کے آثار ہیں جب عربی فارسی کا غلبہ ختم ہورہا تھا اور اردو نے کوئی مشخص شکل اختیار نہیں کی تھی۔

عوام الناس کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک طرف حضرت پیر محمد شاہ خوب میاں چشتی اور شاہ علی جی گام دھنی جیسے بزرگان دین نے رشد و ہدایت کیلئے متداول زبان ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تھا جسمیں ابلاغ مطالبہ مقصود تھا نہ کہ عبارت آرائی تو دوسری طرف فقہاء نے بھی مبادی دینی مسائل مروجہ زبان ہی میں منتقل کرنے شروع کردئیے تھے۔ ایسی فقہی کتابیں بیشتر منظوم ہیں۔ فقہاء نے اپنے اشعار میں اس بات کی وضاحت کا خاص التزام کیا ہے کہ کونسا مسئلہ کس کتاب سے ماخوذ ہے۔ مآخذ مراجع حسب ذیل ہیں:

شرح طحاوی، تبیان، ظہیریہ، ہدایہ مفتاح، فتاوای عالمگیری، معراج الدرایہ قدوری، فقہ الامین، ترغیب الصلوۃ، کنز الدقائق، احیاء علوم الدین، عینی، ملتقط، بحر الرائق الاشباہ والنظائر، فتح الوہاب، فوائد غریبہ، مجمع البحرین، قاضی خان، سراجیہ المبسوط زیلعی وغیرہ وغیرہ۔

ان کی فقہی اہمیت تو ہے ہی مگر ساتھ ہی یہ گجرات میں اردو کے ارتقاء کا ایک مرحلہ بھی ہیں۔ اسوقت کے املا کا طریقہ اسوقت کا لب و لہجہ اور مقامی

زبانوں کے اردو کے سیر تکامل میں حصہ کا ان سے پتہ چلتا ہے اور ان کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ایسی کتابیں اس زمانے کے مسلم معاشرہ کی آئینہ دار ہیں کیونکہ فقہاء نے صرف فقہی مسائل کے بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرہ کی سخت تنقید کی ہے شاعر اسوقت فقیہہ کے ساتھ ساتھ مصلح بھی بن جاتا ہے ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان دین سے کتنے بے بہرہ ہوچکے تھے۔ کس حد تک توہمات کا شکار تھے پیر پرستی اور قبر پرستی کتنی شباب پر تھی شرک و بدعت نے کیا کیا گل کھلائے تھے پیدائش شادی بیاہ اور موت میت کے موقع پر کیسے تمام کی رسم و رواج مروج ہوگئے تھے ہم سایہ اور برادر قوموں کے عقائد کیسے ہم پر مسلط تھے اور عورتوں نے خود نیا دین ایجاد کیا تھا اس کے آگے مشایخ و شرفا نے کیسے بطیب خاطر سر تسلیم خم کیا تھا اشعار اسے سادہ اور قریب الفہم ہیں کہ ان پر مزید تنقید و تبصرہ اعادہ لاطائل اور تکرار غیر ضروری کے مترادف ہے اشعار نقل کرتے وقت اس زمانے کے املا اور طرز تحریر کو محفوظ رکھا گیا ہے۔

مندرجہ ذیل مخطوطات زیر بحث ہیں

(۱) فقہ ہندی

اگرچہ مصنف نے اپنی کتاب کا کوئی نام نہیں رکھا لیکن چونکہ فقہ کی کتاب ہے اور ہندی زبان میں ہے لہذا جلد پر فقہ ہندی لکھ دیا گیا ہے۔ مثنوی کی صنف اختیار کی گئی ہے اور خاتمہ پر ایک فارسی عبارت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا نام عبدالکریم بن شیخ اشرف انصاری، خطیب قلعہ راسین ہے

« اضعف عباد اللہ الراجی رحمت اللہ الباری تعالی عبدالکریم بن شیخ اشرف انصاری خطیب قلعہ راسین کہ بعضی مرمان از مسائل دین خود در کتابہاتی و فارسی عربی خبر ندارند من برای دانستن و یاد گرفتن ایشان چند مسائل از کتب معتبرہ بر آوردہ در زبان ہندی بطریق نظم جمع کردہ ام »

یہ کتاب سنہ ۱۰۷۶ھ رمضان میں بعہد اورنگ زیب تمام ہوئی

فقہ ہندی کوں مومناں انو[1] زباں پر یاد ‏ ‏ ‏ ‏ مسلی[2] آویں دیکھی مول تھوی فساد

سنہ ہزار چھتر میں بیچ رمضاں تمام ‏ ‏ ‏ ‏ اورنگ شاہ کے عہد میں نسخہ ہوا نظام

۱ اُنو: لاؤ یا کرو ۲ مسلی: مسئلے

شاعر ایک جگہ کہتا ہے کہ اس کا مقصد فقہی مسائل کی تعلیم و تفہیم ہے زبان سے اسے غرض نہیں علم غیب اللہ کا خاصہ ہے اسمیں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ اسکی وضاحت کیے بعد شاعر نے خدا کی صفات دلچسپ انداز میں بیان کی ہیں۔

جانو اللہ ایک ہے اور بدوجا کوئی	باری دی سب خلقکوں نی پیار ہی سوی
ناں[1] جوڑا ناں پاتلا ناں تن ناں رنگ جان	ناں بائیں ناں دائیں ناں اوپر ناں تلیں جان
ناں پیچھو ناں بیچ ہی ناں آکوسیں ناں	جی تاہی ن جیو سین ستای ن کان
دیکھتا ہی بن آنکھ سین قادر ن تن جان	
بخشے چھپاوی ملک کوں قادر رب فعال[2]	جو کچھ چاہا سو کیا کری سو ہو فی الحال

(۲) فقہ کی ایک اور منظوم کتاب ہے جس کا کہیں نام درج نہیں ہے اس کی کتابت ۲۶ شوال یوم الاحد سنہ ۱۲۱۴ھ میں ہوئی ہے مگر اسکی سن تالیف سنہ ۱۰۷۷ھ ہے

سنہ یک ہزار و ستر پنہ سات لکھا ہوں اسی سال میں یہ نکات

جن حرف سے شاعر کا نام نکلتا ہے ان کو پہیلی کی شکل میں یوں نظم کیا گیا ہے۔

سوبو تبیں الف ہی وہم لام کاف فہم اسکوں دیکھی تو پاویگا صاف

اس منظوم رسالے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مقامی زبان کے مستعمل مشکل الفاظ کے معانی بین السطور سرخ سیاہی میں لکھ دئیے گئے ہیں نمونے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یوں سب طاعتاں ہیں سوں ایماں پر	جو ہوتیاں ہیں واجب مسلماں پر
نہی پہلا ہی بسم اللہ سو دوسرا	دو ہونچی تک ہات دھو تیسرا
ہی چوتھا توں دندانکوں مسواک کر	اہی پانچواں موںمیں پانی کو بھر
رکوع سجدہ میں انگلیاں پانو کیاں	حرام ہی زمین سوں اٹھانا سوھاں
ہی سجدہ میں سب سنتاں سات جان	اول ھور[3] آخر میں تکبیر آں
خدایا مسلمان ساریاں کیتیں[4]	کرم لطف کر تو نہی ناریاں کتین[5]

(۳) فقہ المبین

بنام پاک رب العالمین سوں شروع کرتا ہوں میں فقہ المبین کوں

---

۱ ناں : نہ ۲ فعال لما یرید اور تونی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء
۳ ھور : اور ۴ کیتیں : کیے تئیں ۵ اللھم اغفر للمسلمین و المسلمات

شاعر کا نام یقین ہے اور اس میں ۶۰۰ سے زیادہ اشعار ہیں

چھ سو ابیات سے زائد کہیا ہوں ۔۔۔ بیان صوم و صلواتونکا کیا ہوں

یہ تصنیف سنہ ۱۱۸۲ھ کی ہے ۔

صد و ہشتاد دو و الف ہجرت ۔۔۔ تاریخ مبارک گشت تمت

اگیارہ سو پر اسی اوپر دو ۔۔۔ سنہ ہجر یسیں[۱] کی تھی جب نایو[۲]

اسکی کتابت ۵ ذی قعدہ بروز دو شنبہ سنہ ۱۲۱۴ھ میں ہوئی ہے ۔ یقین نے عورتوں کی سخت مذمت کی ہے انہوں نے عجیب و غریب رواج نکالے ہیں اور دین کے مسائل میں بھی تصرف کیا ہے فقہی مسئلہ یہ ہے کہ نفاس کا خون بند ہوتے ہی عورت کو غسل کر لینا چاہئیے خون کے بند ہونے کے بعد چالیس روز تک انتظار نہیں کرنا چاہئیے مگر عورتیں .

جہالت میں چہل دن تیں نہ نہاوی ۔۔۔ نماز ان صوم و حج ساری گنواوی

یہ موی کس ہمیشہ ہی نہایا ۔۔۔ انونکا[۳] دین و ایمان سب چھپایا

قیامت میں سب ہی ماخوذ ہو یسگیاں[۴] ۔۔۔ جہنم میں جہالت کی جلینگیاں[۵]

مسلمانوں میں بھی میت پر ماتم اور پیٹنے کی رسم جاری ہوگئی تھی .

رلانی پٹی کوں لعنت آوی ۔۔۔ حشر میں کیا سیہ رو لکیہ جاوی

عورتیں برھمن اور سیوروں[۶] کے پاس آئندہ کی باتیں جاننے کی غرض سے جایا کرتی تھیں غیروں سے انہوں نے ستواسہ اور چھٹی کی رسم سیکھی اور نکاح کو سہل سمجھ کر جاوہ پر زیادہ زور دینے لگیں

جو عورت بھمنوں سے پوچھنے جای ۔۔۔ تو اس بدبخت کیاں[۷] ایمان کیوں آی

کہو کوی جا کی مومن عورتاں سوں ۔۔۔ جو ہویں تائب کفر کی بدعتاںسوں

رسم کرتی ہیں ستواسی کی بسیار ۔۔۔ بھی[۸] چھٹی کی رسوموں سوں سرہ کار

جسی حلوہ پر دل سے اعتقاد آی ۔۔۔ مسلمان بیں[۹] اسی کافر کہا جاری

مخالف نص و قرآن و حدیثات ۔۔۔ یہ کیسا دین تمہارا ھی خبیثات

---

۱ ہجر یسیں ہجری سے ۲ یو : یہ ۳ انونکا : انہوں کا ۴ ہویسگیاں : ہونگی ۵ جلیںگیاں · جلیں گی ۶ سیورے . جین لوگ ، جین سادھو ۷ کیا : کے یہاں ، کے پاس ۸ بھی فارسی لفظ ہم کا ترجمہ ہے فارسی کے طریقہ سے استعمال کیا . ۹ بیں - نہیں

شادی ہو یا موت لوگوں کو کچھ نہ کچھ کھانے پینے چاہیے۔

نقاری ڈھول نحوا کاں پھوڑیں نبی کو چھوڑ کر شیطانسوں جوڑیں
مری کوئی تو اسی پیٹیں ہسو ملعون جوکی فعل پر ہنستا ہی فرعون
پیچھیں خرچیں زیارت کی بہانی پکاویں خوش پلاوان کھیر کھانی
زیارت نام شادی کا کریں ٹھاٹ پکاویں سب وہ بریاں بکریاں کاٹ
اگر سودی ملی تو قرض کاریں ملی نیں بیاجسو تو گھر بیچ ماریں
ملا ملا کو سب قصہ پراویں[1] گواویں ریختہ دھولک بجاویں
ربیں ساری گداریں تان ساری حقہ کش بھنگیاں ہور بے نمازی

قوم میں یہ خراب عادتیں تھیں۔

شرابو بھنگ تماکو بلا ہی نہ بی اسکی حماقت برملا ہی

اس میں سے ستواسہ چھٹی اور زیارت کے کھانے کی رسم آج بھی گجرات کے مسلمانوں میں کم از کم باقی ہے۔

عورتوں نے صحنک کی رسم نکالی ہے اور ان کا بدعتی عقیدہ ہے کہ صحنک کا کھانا مردوں کے لئے جائز نہیں ہے لڑکوں کی موجودگی ممنوع ہے۔

کہتے ہیں کھای نیں او طعام کوی مرد نہ ڈالیں اسپہ قط پرچھاو کوی مرد
نہ حاضر ہویں اس مجلس میں لڑکی ابی رسموسیں کل کھاویگی چرکی
نہ منقول و نہ آیات و حدیثات یہ بدعت کھاسی کاریاں[2] ہیں حبیثات

ایک رسم مہدی کی بھی جاری تھی جو اب نہیں رہی ہے۔

رسم مہدی کی کرتیاں ہیں جبر ہیں و حضرت پیر کا بھی دل میں ڈریں
دیکھو مہدی پہ روشن کر چراغاں منگیں اولاد ملک و ملک و باغاں
چبراویں ہار موگریکی ورای بیل بھی لٹکاتی ہیں میوی کھیل و ناریل
پچھی سجدات کر منگتی ہیں حاجات یہ کیسا کفر ہے یہ کیسی بدعات
حجالت[3] حشر میں کھیچینگی بیحد سبھی کھانی پکانی ہوینگی رد
کسی بدعت سی راضی نیں ہوی پیر رد ہوینگی مٹھائی کھچڑی و کھیر

عورتوں نے کونڈا بھرنے کی رسم بھی ایجاد کی ہے اور شرک کا یہ عالم تھا ہے۔

کھری بدعت ہی کونڈیکی عورات کئے جاری ہیں اس بدعات عورات

---

۱ پراویں : پڑھائیں ۲ نکالی ہیں ۳ حجالت کشیدہ

کبھی رکھتی ہیں سالی ہیں مری پوت — کبھی جانی دھری[1] پوجنے بھوت
کبھی رکھتی ہیں چوٹی پیر کا نام — کبھی مشرک ہو راکھیں سید کا نام
کبھی کا کا سور کوں دل سوں مانی — کبھی ہرت بہ جانا ریل بھانی
کبھی روزہ رکھیں لونڈی دساکا — کبھی مانت کریں شیطاں کی مانکا

پھدالی کی رسم کی مذمت :

پھدالی نے نکالی ہیگی پتی — یقین ہو جو یہ ہیں دوزخ کی تتی
پھدالی کو صریحا ہوتی ہیں — اگرچہ رسم گھر ہی ہوتی ہیں
سماپتی سے دیو کاسر مروگی — جہنم کی سنڈاسوں میں پروگی

عورتوں نے کمج بھرے کی مڈوے کی اور انی جو کی کی رسم جاری کی ہے :

یہ مڈوے کی رسم تمکوں کئی خوار — یہ رھی ایمان ہوئیں سب داخل النار
اوسی ناریں سدیں مانگیں مراداں — چلی جاویگی دوزخ میں ہو شاداں
بچھوں ناریل بھانی کی رسومات — دیوانا کیا لگا ہے تمکوں عورات
صندل گھس گھس لگاویں پی کی تاری — تماری[2] دیکھی رہ رسموں ماری
بچھوں لیا اوربی اکثر اوراویں — ایس کی ہات اپنا گھر جلاویں
کونڈا پھولونکا اس پر ہار ڈالیں — رسوموسوں ایسکوں وار ڈالیں

انی جوکا کی رسم جو عورتوں کا دین تھی، خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منسوب کرتی تھیں ۔

انی جوکا نکالا ہی خبیثات — کہ جسمیں فسق ہاو ہی فسادات
حکہیں معجون کریں سب فسق چالی — پکھاوج دھولکی ہور راگ مالی
سچاویں نی ملا کر راگ گاویں — ملایک و ہاسوں ساری بھاگ جاویں
انی جوکا خدا کے قہر کا نام — کیا عورات اسکو اپنا اسلام
کہتی ہیں بیحیا محروم رحمت — انی جو کا کیا خاتون جنت
معاذاللہ یہ تہمت انپہ کیوں آی — مکر او مفتری جود ویل[3] میں جای

دھولک کی رسم میں قاضی مفتی اور مشائخ شہر بھی شریک تھے :

بنا دھولکی ہونی ہیں ہی شادی — نیابت دی ہی شیطاں انکوں آدمی

---

۱ صدر ۲ تمازی تمہاری ۳ ویل میں جہنم میں

اگر مفلس کی گھر کوی[1] طفل آوی
تو لابد قرض کر اسکوں بلاوی

پکھاوج ڈھولکی مزمار بن کیں
اگر شادی جو ہو تو معتبر نیں

اگر قاضی کیاں جاویں شرف پانیں
و ہمق بھی با ستقبال پیش آویں

مشائخ شہر اونکی اوشیالی[2]
کریں تعظیم ہور دیویں دو شالے

عرس ڈھولی بنا کسکیاں[3] رواہی
نقاری ڈھول بن کیں[4] بھی ہواہی

اگر ہیں ڈھان[5] جسکی گھر میں یک ماں
تو دیویں اسکو پکڑیاں چھیٹکے تہاں

جسی مجمع میں ڈھولی کا گذر نیں
تو او[6] میلا و مجمع معتبر ہیں

حرام ہیں ناچ ہور ڈھولیکی فسادات
بچاو مت ڈومنیاں یہ ہیں خرابات

رسم تعزیہ داری کے خلاف سنئے ۔

رسم تابوت کی کرتی ہیں مہوت
خدا اسکو کریگا حشر میں بہوت

نبی کی آل کی کرتی ہیں تحقیر
یزیدیکی کریں تعریف و توقیر

بنا تابوت جوں بت کر کی ریت
کریں جھک جھک سلاماں با عقیدت

کریں عاشور خانہ ماتم آباد
و لیکن فی الحقیقت عیش بنیاد

رکھیں تابوت اس میں کر کی سنگار
مگس رانی کریں گرد اسکی بیکار

بچھی منگتی ہیں ہمکوں پوت آوی
ترقی رزق ہووی دولت دکھاوی

دیکھو تابوت کوں کیا مانگتی ہیں
اماموسیں بھی افضل جانتی ہیں

علاوی پر ایس کوں وارتی ہیں
علم ہور سیف پٹی جھارتی ہیں

جلا لکڑی نمن[7] ہولی کی کھیلیں
اماموں کی ہزیمت اس میں تولیں

دیکھا دیکھی اپس کوں پیٹتی ہیں
گریباں چاک کر کی بولتی ہیں

بلاویں رام جنیاں چھوکری آنیں
غزل ہور قصہ جانی مرثیہ گانیں

مٹھائیاں دودپیری ہور بتاسی
ملکا پکوا کی کھاتی ہیں خاصی

سنبوسی برفیاں کھاجی منگاویں
ضیافت کر کے دولت مند کھاویں

مساکینوں کو کچھرا دیں تو احساں
ولی بیں جانتی ہیں ان کو انساں

بچھی تابوت سب دریا سی بھراویں
اسی ڈالکو نسوں ماریں ہور ڈوباویں

کجا ماتم کجا غم ہور کجا سوگ
تماشیکا سبھونکوں آلگیا روگ

کسی مذہب میں یہ جائز ہوا ہیں
نہ سنی نہ شیعہ[8] کیں بھی رواں ہیں

---

۱ کوئی　۲ گجراتی لفظ ہے بمعنی انحصار رکھنے والے　۳ کسی کے ہاں
۴ کہیں　۵ اناج　۶ وہ　۷ کی طرح　۸ شیعہ

اس کے علاوہ، عورتوں میں آپس میں ایک ساتھ نہانے کا، ایک ساتھ قضاے حاجت کو جانے کا اور ستر دیکھنے کا رواج عام تھا۔ بعض لوگوں کو جادو سیکھنے اور سفلی علم پر عمل کرنے کا بڑا شوق تھا عورتیں اپنے آپ پر جن یا بھوت کو خود سوار کرتی تھیں، پھر سر دھنتی جاتیں اور غیب کی باتیں بتانے لگتی تھیں۔ اور لوگ بھی استفسار غیب کے لئے ان کے در پر حاضر ہوا کرتے تھے

(۴) مختصر المسائل :

ایسا ہی ایک فقہ منظوم رسالہ ہے جس کا نام مختصر المسائل ہے۔ عبدالکریم نے اس کو سنہ ۱۲۵۱ھ میں پیران پٹن میں تصنیف کیا تھا۔

کتابیں فقہ کی جو ہیں قدیم اب   ہی لکھتا اس میں سے عبدالکریم اب
رکھا نام اس کا مختصر المسائل   سنو ای دوستو فرح شمایل
تواریخ اسکی ای یارو سنو تم   تمارا دل اگر چاہے کہو تم
کہ بارہ سو اکیاون کا برس تھا   شہر رمضاں کا اس میں سرس[1] تھا
یہ نسخہ آنکی پونچا تمامی   بروز پنج شنبہ والسلامی
میں تھا پیران پٹن شہر کے بیچ   یہ نسخہ بن گیا یک لہر کے بیچ

عبدالکافی ولد عبدالشافی ولد عبدالباقی نے سنہ ۱۲۵۵ھ میں درویش میاں عبداللہ کے لئے اس نسخہ کی کتابت بروز جمعرات کی ہے۔ مصنف نے ایک جگہ اردو گجراتی کہا ہے۔

عزیزو اس لئے ہندی زباں میں   میں کہتا ہوں کہ سب جانیں جہاں میں
زباں اُردو گجراتی ہم ہیں   رواج اس ملک میں اردو کا کم ہی
بنایا اس لئے دونوں ملا کر   پڑیں اسکوں سبی سب دللگاکر[2]
غرض مسلہ سی ہی کوئی زباں ہو   سمجھنا چاہی مطلب عیاں ہو

شاعر بذات خود فقیہ ہے وہ شعر گوئی کی مذمت کرتا ہے۔

فقہ کے بیچ میں ایسا ہے مکتوب   بنانا شعر کا اچھا نہیں خوب
نظم میں فقہ ہو اور دین کی بات   تو بہتر ہی والا ہی ہیہات
نہیں ہی اور کچھ اچھا بنانا   ردیف و قافیہ میں دن گنوانا
اگر یہ سب روا ہوتا ای بھائی   بنانا ریختہ قصہ رباعی

---

۱ اچھا خوب   ۲ دل لگاکر

تو کرتا اس طرح ہیں نکتہ دانی　　کہ جاتے بھول شعراء شعر خوانی

عبدالکریم نے بھی مسلمانوں کے معاشرہ کی سخت تنقید کی ہے ۔ پردہ کے متعلق لکھتے ہیں ۔

زمانہ کس طرح کا ہے یہ آیا　　نہیں کچھ پردہ داری کا ہی پایا
کہ ظاہر میں زیارت کا بہانہ　　وہی مقصود چہرہ کا دکھانا
خصوصاً اس ضلع گجرات کے بیچ　　نہیں ہی کچھ شرم اس بات کے بیچ
کہ پردہ گھر میں شرفاؤ نکی کم ہی　　جہالونکی[1] تو یہ راہ و رسم ہی

مسلمانوں میں شرک و بدعت میں فقہاالمدین کے زمانے سے کچھ اضافہ ہی ہوا تھا ۔ عبدالکریم کو بھی عورتوں سے شکایت ہے جو طرح طرح کے غیر اسلامی روزہ کا اہتمام کرتی ہیں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر شرک صریح کی مرتکب ہوتی ہیں ۔

یہاں کی عورتیں کم بخت جاہل　　بہوت ہیں دین کی اندر وہ کاہل
و بدعت شرک اند چست چالاک　　نہیں ایمان سی ان کو ذرا باک
رکھیں بی بی کا روزہ ہوی خوشحال　　نکالا ہی یہ کم بختوں نے کیا چال
کبھی روزہ رکھیں بیلی سید کا　　نہیں کچھ فہم انکوں نیک و بد کا
کبھی کل بل کا روزہ راکھتی ہیں　　پکا کر خوب کھانا چاکوتی ہیں
بہت پیروں کتیں یوں مانتی ہیں　　نفا[2] نقصان انوسی[3] جانتی ہیں

پیر پرستی اور قبر پرستی عام تھی :

کبھی ولیوں کی قبروں پر جو جاویں　　مراداں دیو تو ہم مانت چھڑاویں
اگر جیتا رکھو یہ پوت میرا　　چھڑاویں کی تمیں چدر و سیرا[4]
کبھی کوئی کہ تم پر جاؤں واری　　کبھی دیو پوت ہی آسا ہماری
کوئی جا پھول چھلہ پر چھڑاویں　　ادب تعظیم سے اس کا بجاویں
سنو یارو ایک ان کی دوسری بات　　کیا ہیگا وہ برپا کیا فسادات
رسم اکثر ہی جب ہو رہوی شادی　　تو پھر کرتی ہیں وہ کیا نامداری
ہی قبر ایک نام اس کا جلوہ رانی　　وہاں جاکر کریں سب میہمانی
و دلہن اور دولہے کو لے جاویں　　گرد اس گور کی پھیرا پھراویں
یہاں تک کہ پھری وہ سات پھیرا　　یہ کم بخق نے کیسی آن گھیرا

---

۱ جہال ۔ جمع جاہل ، جہالوں اور مساکینوں جیسی ہندی طریقہ جمع الجمع بنانے کا رواج تھا۔　۲ نفع　۳ انہوں سے　۴ شیرہ مشہور ہے ۔

دین کی گرفت کتنی ڈھیلی ہوچکی تھی اور انحطاط کس حد تک تھا اسکی یہ مثال ہے :

عرض ایسی ہیں بس رسم و رسومات — لکھوں کیا کیا میں ان کا شرک و بدعات
کوئی پیروں کی رکھی نام چوٹلی — کہاں جائز ہی در اسلام چوٹلی
کوئی دیکھے شگون اس بعد جاوی — شگوں بد ہو تو پھر پیچھی گھر آوی
کوئی تو ناک لڑکی کی چھیداوی — مری نان پوت کچھ آفت نہ آوی
کوئی لڑکی کو لی بت پاس جاوی — و بھمن سیوڑوں سے دم کراوی
کبھی نکلی سیل[1] لڑکی کوں آکر — کتی میں پوجتی ماتا کو جاکر

کرو ہندو کی مت رسم و رسومات
کفر ھی اے مسلمانوں سنو بات

(۵) فقہ آساں یا فقہ ہندی ۰

اس کے بعد آخری مخطوطہ جس کا ذکر اس مقالہ میں ضروری ہے اس کا نام فقہ آساں ۔

نام اس کتاب کا رکھا فقہ آساں — اسکوں جو کو کوئی سیکھی کا سی دو جہاں اماں

اس رسالے کا مقصد شاعری نہیں ہے ۰

وزن و قوافی بتیوں کا ذرہ نہیں مقصود — آویں مسائل دیکھی اور عاقبت محمود

شاعر کا تخلص عرفاں ہے ۔

یہ عرفاں کے رسالے ختم کا ہے — امید مغفرت ہر دم بہ دم ہے

اس کی سن تالیف سنہ ۱۲۴۰ھ ہے ۰

« تمت الکتاب الفقہ الہندی فی یوم تسع من شہر شعبان المعظم ملک قاضی علی ساکن بہالک در محلہ پنچ ہتی بہ مسجد حسن شہید ۱۲۴۰ھ نبوی صلعم »

فقہ ہندی کی دوسری جلد ہے جس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے ۔

« در احمد آباد بماہ جمادی الثانی تمت تمام شد ۱۲۴۱ھ برای قاضی علی نوشتہ شـــد » ۔

جہالت نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھی تسویل شیطانی کو وسیع میدان ہاتھ لگا تھا اور احکام خداوندی سے لوگ غافل تھے ۔ شاعر کہتا ہے :

ہر قوم ہر ملک کی ہیں بدعتاں جدی — ہر شہر کی ہر بستی کی ہیں بدعتاں جدی

---

[1] گجراتی لفظ شیتلا ہے یعنی چیچک ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ایسے موقع پر ایک خاص ماتا یا دیوی کو پوجنا چاہیے دوا کرنے سے فائدہ نہیں ہوتا ۔

شاعر نے سچ کہا ہے ۔ ایک زمانہ تھا جب ہر بستی کا ایک مسلک تھا، ہر گروہ کا کا ایک پیر تھا، ہر قبیلہ کا ایک مذہب تھا ۔ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے مختلف غیر اسلامی عقاید تھے جب تک کسی معین پیر کی قبر پر جاکر مخصوص رسم ادا نہ کرتے تھے تب تک بعض لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو شلوار نہ پہناتے بعض لوگ کسی مخصوص پیر کی قبر پر جاکر اپنے بچوں کے بال نہ اتارتے تھے تب تک اس بچے کے سر کی حجامت روا نہیں سمجھتے تھے ۔ کہیں دودھ، چاول ، کہیں کھیر کہیں مالیدہ ، کہیں ناریل ضروری سمجھے جاتے تھے ۔ اولیاء اللہ کی قبروں پر پھولوں کے ساتھ ساتھ کپڑے کے بھوسہ بھرے ہوئے گھوڑے اور لکڑے کے پالنے بکثرت ملتے تھے ہر ایک ولی اللہ ایک خاص قسم کی مراد بر آری کے لئے مختص سمجھے جاتے تھے جنکی حیثیت یوں سمجھہ لیجئیے کہ ایک (कुळ देवता) کی ہوگئی تھی ۔

اگر میت ہو جائے تو لوگ سمجھتے تھے کہ پانی باہر سے بھرنا چاہیے اور مردہ کو غسل دینے کیلئے جس برتن میں پانی گرم کیا جاتا وہ برتن ان کے نزدیک پھر کسی کام کا نہ رہتا تھا ۔

جب گھر کے پانی باسن[1] سی ترا غسل روا　　تب موت گھر میں ہوئے سی باسن کو کیا ہوا
تم بدعتاں نہیں چھوڑتی ہو تم کو کیا ہوا　　اور موت گھر میں ہوئی سی پانی کو کیا ہوا
جس لنگی سی مسلمان مردہ کا ستر ہوا　　مبارک ہوی لنگی اسی سے فرض ادا ہوا
بعض شہروں میں رنگتی ہیں ستی میں لنگی کو　　سفید میں ستر کم ہی رنگو تم لنگی کو

شاعر کہتا ہے کسی کے مرنے کے بعد تیسرے دن زیارت کا کھانا کھلانا مکروہ ہے بدعت ہے مستحب تو یہ ہے کہ عزیز و اقارب اس کے گھر کھانا بھیجیں ، ہمسایہ بھی یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں

پن[2] مستحب تو یہ ہی سگی[3] انکوں بھیجیں کھانا　　فتح القدیر سی ہم نی یہ مسلہ پہچانا

موت کے بارے عجیب توہمات رائج تھے ۔ لوگ ماتم کرتے ، کپڑا پھاڑتے اور رانوں پر ہاتھ مارتے ، کئی دن سوگ مناتے ، آگ نہ سلگاتے ، میت سے ڈرتے اور جس پر مردہ کو غسل دیا گیا ہو اس تختہ کو لینے بھی ڈرتے تھے

منگل کے دن میت کو بجس نا بوجھنا　　منگل کے دن صدیقہ کی وفات بوجھنا
جب سی نبی صاحب کا دنیا نی[4] دیکھا دیدار　　سی[5] دن مبارک ہیں دل میں اپنے اتار

---

۱ برتن　　۲ پر ، لیکن　　۳ عزیز و اقارب　　۴ نے　　۵ سب ہی

صفر کی بھی مہینہ کو اب نحس مت کہو — سراسر خیر و خوبی سب مہینوں میں کہو
زمین پر سونا عدت میں کفاروں کی چال — حلال کھانے چھوڑنا کفاروں کی چال
بعض جاہل شادی نہیں کرتی ہیں چالیس دن — شیطاں کے ہیں بھائی انکو احمقوں میں گن[1]
ان سی زیادہ احمق کہتے ہیں برس میں ہوا — مرنا تو حق کا حکم ہی توں احمق کیوں ہوا
خاتون جنت کی رحلت پیچھی حضرت علی — کیا نکاح تین دن پیچھی سن ای لی

دیکھئیے لوگ کیسی کیسی نذریں مانتے تھے ۔

نقارہ لاؤنگا اور ایک بکرا لاؤنگا — درگاہ کی خدام کو بورہ پلاؤں گا
ای اولیاء اگر مری مسافر کو لی آوو — سونا روپا یا شمع اور تیل لاؤں اگر تم لاؤ
ورنہ اگر دو گی رکھوں کا اسکی سر پر بال — صندلی کو لی آؤنگا بھاوینگی وہ تال
اور پاؤں میں بیڑی اور بالی کانوں میں ڈالوں — درگاہ کی سیری[2] جھاڑوں میری سر کی بالوں

لوگوں کا خیال تھا کہ اگر منتیں نہ مانیں گے تو یہ حال ہوگا

جاہل کہی ہیں نا دیکھی تو مرجاویگا پوت — ہمارے کام بگڑیں گی گھر میں آویگی بھوت
پیروں کی منتاں نہیں دی گیا ہی گھر کا چین — گھر لی چین پر مست دیویں تو ہوویگا چین

شاعر کہتا ہے لوگوں تم نے اولیاء اللہ کو گراسیہ[3] ڈاکو بھیل کولی بھوت اور خبیث کی صف لا کھڑا کردیا کہ تم نے منت پوری نہ کی اور انہوں نے تم کو لوٹ لیا۔ تمہارا چین چھین لیا

گراسیہ ڈاکی ایذا کر لیتی ہیں — قذاک[4] بھیل کولی ایذا دی لیتی ہیں
غنیم حاکم ظالم ایذا دی کر لیتی ہیں — خبیث بھوت بودی ایذا دی کرلیتی ہیں

لوگ مرنے والے کا تیجا ، چوتھا ، برسی وغیرہ کرتے تھے ۔ اس کے نام کی خیراتیں کرتے اور اس وقت قسم قسم کے کھانے موجود ہوتے تھے ۔ مثلاً حلوا مٹھائی ، نان بادر خانی ، کابجی ، کیلے ، کھیر ، حلیبی پوری وغیرہ وغیرہ شاعر کہتا ہے ہر ایک موقع خواہ خوشی کا ہو خواہ غم کا تمہارے لئے میزبانی اور ضیافت کی تقریب بن کے رہ گیا ہے اور تم نے کھانے پکانے کو دین سمجھ لیا ہے ۔

نبی صاحب نے تیجا ، چوتھا جمع راتاں نہیں کی — دسواں اور بیسواں مہینی کی رسماں نہیں کی
چالیسواں اور ساٹھی تو نبی صاحب نہیں کی — اور تین ماہی چھ ماہی نبی صاحب نہیں کی
اور نو ماہی اور برسی بھی نبی صاحب نہیں کی — نبی صاحب نہیں کیا عـــــرس بھی ہرگز

---

۱ گن ۲ سیڑھی ، زینہ ۳ ایک قوم کا نام ہے جس کا پیشہ قزاقی تھا ۔ ۴ قزاق

آگے چل کر شاعر کہتا کہ عرس تو خیر بعد میں اولیاء اللہ اور مشائخ نے شروع کیا ، ان کا مقصد جو بھی ہو مگر تم لوگ جو یہ خرافات شرک اور بدعت کرتے رہتے ہو اس سے عرس بدنام ہوگیا ۔ عرس کے نام پر مندرجہ ذیل باتوں کو کیسے گوارا کیا جائے ۔

پر جب کریں یہ نیکیاں تب عرس ہے روا　　نقارہ باج اور پوجا قبر کی نہیں روا
اور پھول شکر ڈال کر ندی کوا[1] مت پوج　　نادان جاہل مت رہ ان مسائل کو بوج
کپڑی کی کھورا لکڑی کی لٹکانا حرام　　ہر چیز کی بھی مورتاں بنوانا ہی حرام
پانی مت وار و گور کا طواف مت کرو　　تم اپنی تئیں جہالت میں فضیحت مت کرو
اور بڑیان اور طوق کا ارمان مت کر　　یہ زیور ہیگا دوزخ کا اس سے بہت ڈرو
کمار ناریل بتوں پر لے جاتی ہیگی　　تو کوروں[2] پر لیجا مت کافر کی رسم ہیگی
اور کوروں پر پیراں واسطی ذبح مت کر رفیق　　اور کای نیل پارہ بھیس بکرہ کر تحقیق
اور پیروں کا طبق اور مہندی جلی کا کھانا　　افسوس ہی کہ آج تک تو نے نہ پہچانا
ندی نالی ھسلی کی پیر پر تہمت مت کر　　شرع میں جو حرام ہیر کیوں کھوہیں کر

چند برسوں پہلے رواج تھا مگر اب ترک ہے کہ شادی سے کچھ دن پہلے دولہا ہاتھ میں مانجھا باندھ کر اپنے بعض دوستوں کے ہمراہ ہاتھ میں ناؤ لے کر سابرمتی ندی پر جاتا تھا اور ہدالی آگے دف بجاتا ہوا چلتا تھا اس سے پہلے رنگ کھیلنے کی رسم ادا کی جاتی تھی سب کے کپڑے لال پیلے رنگ کے ہوتے تھے ۔ دولہا یہ رنگین کپڑے نوشاہ بنتا تب اتارتا تھا اس سے قبل نہیں ۔ ندی پر جاکر دودھ چاول یا مالیدہ کھاتے ، حضرت خضر علیہ السلام کو فاتحہ دلاتے اور ناؤ تیرا دیتے اور امید کرتے تھے کہ اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام دولہا دلہن کی زندگی کی ناؤ کو بھی کنارے لگادیں گے اسی لئے شاعر فقیہہ کہتا ہے :

اور ناؤ مت ڈوباؤ یہ تو بد فالی ہینگی　　شیطان نی یہ کھر کی بھی ڈالی ہیگی
ندی کی پوجا نیں جانز خضر نیں ہینکی وہاں　　حضر گر ہوتی تو بی پوجا روا ہی کاں[3]
اور موب مکرہ مت پوجو کوئی پوجا مت کرو　　ایمان جاہے سی ای صاحب درہ تو ڈرو
جب نیل کا ڈورا اپنی موب[4] پر باندھو　　عالم فرماویں کی تم پوجا مت کرو باندھو

---

۱ کنواں　　۲ گور ، قبر　　۳ کہاں　　۴ گجراتی لفظ ہے موبھ (Beam)

اور سنئیے

مرغا بٹیلی پیر کا حرام یا حلال تحقیق کر کی کھاؤ مت لیجیو تم وبال
رجب سالار پیر کی رسماں سب مکروہ مکروہ کیا گناہ ہی ہرگز مت کر مکروہ
جب غیب کی خبراں سچا ویں ہو بیگی کافر کل کی خبر بن اللہ جانے تو مت ہو کافر

دیوالی کی ہر ایک ہندو رسم کو مسلمانوں نے اپنا لیا تھا جس دفتر میں حساب کتاب لکھا جاتا ہے اسکو گجراتی میں « بہی » یا « کھاتا وہی »[1] کہتے ہیں۔ ہندو حضرات دیوالی کے موقع پر ہر سال ایک نیا دفتر لکھنا شروع کرتے ہیں ، اس کی پوجا کی جاتی ہے جس کو « چوپڑا پوجا » کہتے ہیں شاعر کہتا ہے

« بہی » کی پوجا مت کر بی دی تیری کھور اندر مسلم ہوکر داخل مت ہو کفاروں اندر
دیوالی کوں کھر میں رست مت کر مت ہو کافر کفاروں کی صحبت میں تو جہنم میں مت گر
اور رام پٹی مت تم دروازہ پر لٹکاؤ خوشی سی کافر ہوکر جہنم میں مت جاؤ
دیوالی کی واسطی کھر میں چونہ[2] مت لگاؤ کفاروں کی چالاں اپنے اڑکوں مت لگاؤ
« بہی » اور چوپڑی[3] محرم سے شروع کرو کفاروں کی چالاں چھوڑو و خدا سے ڈرو
دھومت روپا روپی سونا سکا کی کھر میں دود کافر مت ہو گماشتوں کی صحبت میں مردود

دکانوں پر جو لوگ نوکری کرتے ہیں انہیں آج بھی گماشتہ کہتے ہیں ۔ مسلمان دکان داروں کے یہاں ہندو حضرات ہی اکثر گماشتہ ہوا کرتے تھے اسی لئے شاعر دکان سے متعلق شرک و بدعت کی ہر اس رسم کو جو دیوالی کے موقع پر جاری ہوگئی تھی ان ہی گماشتوں کا براہ راست اثر سمجھتا ہے ۔ اس کے علاوہ آتش بازی کرنا دیواروں پر راکھی جیسے ڈورے باندھنا ، چوپڑوں پر تیلا کرنا وغیرہ جیسے رواج مسلمانوں میں بھی آگئے تھے ۔ سب سے عجیب و غریب یہ بات ہے ۔

اور مورتاں دیوالی کی سمدانی میں مت بھیجو تم بھی کافر مت ہو سمدی کو کافر مت بناؤ

چند سال قبل تک یہ رواج تھا کہ محرم کے عشرہ میں ماں باپ اپنے بچوں کو مانگ کر کپڑے پہناتے کپڑے ہرے رنگ کے ہوتے تھے وہ بچہ امام حسین علیہ السلام کا فقیر کہلاتا تھا اس کے گلے میں زنار کی طرح ایک دورا ہوتا تھا

---

[1] खाता वही वही [2] White Wash [3] چوپڑے = دفتر Account Book

جسکو آنٹا یا باڑا کہتے تھے ۔ لوگ بہروپیے بن کر نکلتے ۔ انہیں گرو کہا جاتا تھا
شاعر محرم کی تمام خرافات کی سخت مذمت کرتا ہے اس کا خیال ہے یہ سپوڑوں
یعنی جین قوم کی نقالی ہے۔

محرم میں بجا مت ڈھول بھیک بی حرام	حرام ہی ہو ایسی بھیک کا کھاوی طعام
انصاف کر تیرا باپ مری تو یوں کری	ما بھوں کو تو راگ بالی میں رسوا کری
بتاوی شاہ بالی اور خوشوقتیاں[1] کری	نقاری ڈھول مسخری کی مجلساں کری
توں مورتاں بنا کر ان سی مسخری کری	توبہ تو کر نہیں بی شک جہنم میں کری
براق کی دلدل کی تو بے مسخری بی کی	ہاتی گھوڑا بنا حق کی مسخری بی کی
بھروپیوں کے بھیس اور املم سے مراح	توبہ کر توبہ یا حق کری تیری دلمیں سوراخ
اماموں سے مراح[2] اس کا نام ماتم	توبہ کرو یا دوزخ میں پر اگا تم پر غم
آنٹی باڑی ہاتوں گلی میں پر کر مت ڈالو	امامی ہو تو شمر کی بھیس پر کر مت لو
جھولی بندھا بھیک سی امام راضی ہیں	تحقیق کر خدا رسول پر کر راضی ہیں
نا چال ہی یہ سی کی نہ شیعہ کی چال	کفاروں کی چال ہی تحقیق کر یہ چال

بدعات سیئہ سے منع کرو تو عام طور پر لوگ یہی کہتے ہیں کہ یہ پرانے
زمانے سے ہوتا آیا ہے ۔ شاعر پوچھتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالی علیہ و سلم کے
زمانے میں صحابہ اور تابعین کے زمانے میں ایسا ہوتا تھا؟ بلکہ صرف تین سو برس
ہوئے ہیں ۔ یہ رسمیں جاری ہوئی ہیں ۔

صرف تین سو برس ہوی اس بدعت ملعون کو
اگر ہی زور علم دکھا کتاب ہم کو

صفر کے مہینہ کے آخری بدھ کو لوگ آج بھی مقدس خیال کرتے ہیں اس روز
صرف تلا ہوا کھانا کھاتے ہیں جسکو یہاں کی اصطلاح میں تاں کہتے ہیں ۔ اگرچہ
اب یہ رسم بھی کچھ کم ہوگئی شاعر اسکی بھی سخت مذمت کرتا ہے ۔

اور چار شنبہ آخری کا ست بین تلں
بلکہ تماری ملک کی رسم ھی یہ چلں

---

۱ خوش وقتی کی جمع ۲ مذاق ، استہزاء

پچھلے چار سو سال میں گجرات میں کئی اولیاءاللہ گذرے ، کئی صوفیائے کرام گذرے ہیں۔ ان کا سلسلہ رشد و ہدایت ہوں جاری رہا ہے ۔ انکی تصانیف بھی ملتی ہیں اور اورنگ زیب جیسے متدین سلطان بھی گذرے ہیں مگر کسی کے یہاں بدعت شرک و خرافات کی اس دیمک کا ہلکا اشارہ تک نہیں جس نے دین کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ ان بزرگوں کی کتابوں میں تصوف ، سلوک اور معرفت کے دقیق مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ مگر شریعت کو جو خطرہ لاحق ہوگیا تھا اس کا کوئی احساس اور کرب نہیں ملتا۔ بس اسی بات کی حیرت ہے ۔ کئی سوال اٹھتے ہیں جن کا تعلق مزید تحقیق سے ہے۔ لہذا فقہاء کی اس سلسلہ میں جو مساعی جمیلہ ہیں اسکی قدر و قیمت اور بھی ہماری نگاہوں میں بڑھ جاتی ہے ۔ یہ فقہاء غیر معروف تھے ۔ معلوم نہیں ان کا دائرۂ اثر کتنا وسیع تھا لیکن بزرگان دین سے لوگوں کو بلا کی عقیدت تھی اور امراء الناس علی دین ملوکھم کے تحت آتے ہیں۔ اگر یہ حضرات اس طرف توجہ کرتے تو خاطر خواہ نتائج جلدی آسکتے تھے ۔

گجرات میں اردو کے ارتقاء کی تاریخ لکھتے وقت ولی کے دیوان ، خوب میاں چشتی کی خوب ترنگ کے کلام کے ساتھ ایسی فقہی منظومات کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے ۔

[اس مقالہ میں شامل اشعار میں جہاں « ٹ » یا « ڈ » یا اس قسم کے ہندی حروف آئے ہیں وہاں قلمی نسخوں میں چار نقطہ استعمال کئے گئے ہیں البتہ « ڈ » میں یہ چار نقطہ کہیں ڈ کے اوپر اور کہیں نیچے بنائے گئے ہیں۔ (مدیر)]

●

ڈاکٹر مظفر حنفی
شعبۂ اردو ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

اردو شاعری اور ہندوستانیت
(نئی غزل کے خصوصی حوالے سے ایک مطالعہ)

اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی جیتی جاگتی نشانی ہے اور ہماری گنگا جمنی تہذیب اور ہند ایرانی کلچر کی منہ بولتی تصویر ہے ۔ اس معاملے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ ہر ادب اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ چنانچہ مقامی عنصر جغرافیائی حالات ، عقائد و رسوم ، تہذیب و تمدن ، تقریبات و تہوار نیز معاشرتی زندگی کے دوسرے تمام پہلو اپنے عہد کی ادبی تخلیقات میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں ۔ ہر چند کہ اردو زبان پر عربی اور فارسی کا اثر ہے لیکن ان زبانوں کے اثرات منفی نہیں مثبت ہیں ، ان عناصر نے اردو ادب میں ہندوستانی عناصر کے ساتھ آمیز ہوکر رنگ برنگی تصویریں تخلیق کی ہیں اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کے مرقعے اپنے دامن میں محفوظ کرلیے ہیں ۔ یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جہاں تک عربی کا تعلق ہے اردو پر اس کے اثرات براہ راست نہیں بلکہ بیشتر فارسی کے توسط سے مرتسم ہوئے ہیں اور اردو نے جس کے زیر اثر تربیت پائی وہ بھی بیرونی زبان نہیں بلکہ وہ فارسی تھی جس کی روایات صدیوں سے ہندوستانی فضا میں پروان چڑھ رہی تھیں اور اسے سبک ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ ہندوستانی فارسی ہندوستانی عوام کے بڑے حلقے اور خواص میں مستعمل تھی بہت سے ہندوستانی شاعر اسی سبک ہندی میں شاعری کرتے تھے اور ان کے فارسی کلام میں ہندوستانی عناصر کی بہتات ہے ، مثال کے طور پر امیر خسرو کا فارسی کلام اور عبدالرحیم خان خاناں کی فارسی شاعری میں مقامی ماحول اور دیسی فضا قدم قدم پر نظر آتی ہے ۔

اردو کے عہد بہ عہد ارتقاء کا جائزہ لیجیے تو دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ امیر خسرو جیسے عظیم المرتبت فنکار کے ہندوی کلام میں اپنے ابتدائی نقوش کی جھلک دکھاتی ہے اور ساون ، بادل کے گیتوں نیز کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں کی شکل میں لوک گیتوں جیسی مقبولیت حاصل کرتی ہے ، آگے چل کر افضل جھنجھانوی

اردو میں بارہ ماسہ جیسی صنف سخن کی داغ بیل ڈالتے ہیں ، جس میں ہندوستانی موسم اور ہندوستانی عورت کے داخلی جذبات ایک دوسرے سے مل کر شیر و شکر کا سا لطف پیدا کرتے ہیں . صحیح معنوں میں اپنی ادبی حیثیت اردو نے دکن میں جاکر مستحکم کی دکنی شعرا نے فارسی کے زیر اثر عجم کی روایات سے خود استفادہ کیا لیکن اپنی سر زمین کی بو باس کو شاعری میں زیادہ سے زیادہ جگہ دی چنانچہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور گولکنڈہ کے حکمراں قلی قطب شاہ کے کلام میں محبوبہ کی بڑی بڑی آنکھوں کے لئے بیل کی آنکھیں ، بازوؤں کے لئے کیلے کے تنے اور خرام ناز کے لئے ہاتھی کی چال سے تشبیہ دی جاتی ہے . اس رجحان کو دکن میں بہت فروغ ملا چنانچہ دکنی غزل گویوں کے سرتاج ولی کے ہاں بھی بکثرت ہندوستانی تلمیحات استعمال کی گئی ہیں اور جب ان غزلوں کے زیر اثر شمالی ہند کے شعرا نے بھی اردو ادب کی جانب اپنی توجہ مبذول کی تو ان کے سامنے اگر ایک طرف فارسی غزلوں کا معیار اور عجمی روایات تھیں تو دوسری طرف قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے کلام کے ہندوستانی عناصر سے اثرپذیر ہوتے بھی رہے ہیں .

میر کی مثنویاں ہوں یا شکار نامے ، ہر جگہ مقامی رنگ اور ہندوستانی فضا نظر آتی ہے حتیٰ کہ سودا کے قصائد کی بہاریہ تشبیب میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے بالخصوص سودا کا وہ قصیدہ جو آصف الدولہ کی مدح میں ہے ، اس دور کے طریقۂ حرب و جنگ کی منہ بولتی تصویر ہے . یہی حال ان کے ہجویہ قصیدوں اور شہر آشوب کا بھی ہے . انشا کے قصیدوں میں بھی اودھی تلمیحات اور انگریزوں کی آمد آمد نظر آتی ہے یہی وہ دور ہے جب نظیر اکبر آبادی نے اردو ادب میں باقاعدہ نظم نگاری کی روایت قائم کی ان کی نظموں کا اہم ترین وصف ہی یہ قرار پایا کہ انھوں نے اپنے ارد گرد بکھری ہوئی حقیقی زندگی سے مواد حاصل کیا ہے . ہندوستانی تہذیب ، رسم و رواج ، میلے ، تیوہار ، کھیل تماشے ، موسم ، مناظر فطرت ، دیوی دیوتا ، عقیدے اور تقریبات ، کوئی بھی پہلو ان کی نظموں کی دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکا . یہی حال مرثیہ نگاروں کا ہے ، ہر چند کہ انیس و دبیر کے مرثیے واقعات کربلا سے متعلق ہیں اور ان کے کردار عربی ہیں لیکن ان کی روح ہندوستانی ہے ان کی

نشست و برخواست، طرز گفتگو، رسم و رواج حتیٰ کہ مزاج تک ہندوستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان مرثیوں کے کئی بین ایسے ہیں کہ بیساختہ شروں کمار کی لاش پر اس کے اندھے ماں باپ کی گریہ و زاری یاد آجاتی ہے۔ مثنویاں بھی ہندوستانی عناصر سے عاری نہیں ہیں۔ «سحرالبیاں»، «گلزار نسیم»، «زہر عشق» میں ان کی جھلک قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ واجد علی شاہ کے رہس، امانت کی اندر سبھا اور واسوخت، رنگین اور جان صاحب کی ریختی غرض کوئی صنف سخن ایسی نہیں جو ہندوستانی رنگ میں رنگی ہوئی نہ ہو۔ محمد حسین آزاد نے نیچرل شاعری کا پرچم بلند کیا تو اس کے سائے تلے جمع ہونے والے نظم گویوں کے لئے لازمی ہو گیا کہ اپنے معاشرے اور ماحول کی حقیقی ترجمانی کریں حالی کی مسدس اپنے سماج کا آئینہ ہے۔ رفتہ رفتہ اردو نظم کی روایت جواں ہوئی اور اکبر، چکبست، اقبال، اختر شیرانی، جوش، احسان دانش، میرا جی، شاد عارفی، فیض وغیرہ کے کلام میں ان کے عہــــد کی ہندوستانی زندگی مختلف انداز سے جلوہ گر ہوئی یہاں گیتا اور رامائن جیسے مذہبی صحیفوں کے منظوم تراجم کا ذکر بھی لازمی ہے۔ ان دونوں کے درجنوں منظوم تراجم اردو میں موجود ہیں اور ان سے متعلق ضمنی داستانوں پر مشتمل نظموں کی ایک بڑی تعداد ہے اردو ادب کے مصنفین و مترجمین میں ہندو اور مسلمان فنکار دوش بدوش نظر آتے ہیں [1]

سنہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جب اردو ادب میں جدیدیت کا دور دورہ ہوا تو اس کے بڑے مفید نتائج برآمد ہوئے اور اردو شاعری میں ہندوستان زیادہ پھیل کر داخل ہوا اور دیو مالائی علامت نگاری کو فروغ ملا نظم چونکہ ایک اکائی ہوتی ہے خصوصاً نئی نظم میں وحدت تاثیر کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے اس لیے میں نظموں سے اقتباسات پیش کرنے سے گریز کروں گا۔ جدید نظم پر ہندوستانی تشبیہات، تلمیحات اور مقامی ماحول کا جو گہرا اثر ہے اس کا اندازہ اس بات سے سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں شاعروں نے اپنی تخلیقات کے مجموعے اس قسم کے ناموں سے بھی پیش کیے ہیں:

---

۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مضمون «رامائن اردو میں» (مشمولہ «نقد ریزے» از مظفر حنفی)

«کاویم» — کاوش بدری، «امرائی» — بدیع الزماں خاور، «ولاس یاترا» — کمار پاشی، «کلکتہ ایک رباب» — حرمت الاکرام، «اتسلسلہ» — عقیل جاوید ساغر - راہی فدائی، «دھرتی کی خوشبو» - نو بہار صابر - «دیپک راگ» مظفر حنفی

اردو کی نئی نظموں میں ہندوستانیت جس حد تک رو نما ہوئی ہے اور ان میں ہندوستانی دیو مالا سے جتنا استفادہ کیا گیا ہے اس کے نمونے پیش کیے جائیں تو سیکڑوں صفحات بھی نا کافی ہوں گے۔ ذیل میں چند نظموں کے عنوانات درج کیے جاتے ہیں کہ اہل نظر نمونے کے چند چاول دیکھ کر پوری دیگ کا اندازہ کرلیں

«اندھیر نگری»، «دسہرہ»، «ہولی»، «دیوالی»، «گنگا اشنان»، «مندر جانے والی»
(شاد عارفی)

«میرے لال»، «آکاش بیل»، «سہج چلے پروائی»، «دوجا سایہ»، «لوری»
(فہمیدہ ریاض)

«اماوس کا جادو» - (حرمت الاکرام)، «شگون» - (مخمور سعیدی)، «سرسوتی» «گنگا آدرش» - (مظہر امام)، «رہبر کا سمندر» - (لطف الرحمن)، «کال کوٹھری» «گوتم کا خط»، «قصہ طوطا مینا جدید»، «لچھمن ریکھا» - (مظفر حنفی)
«تناسخ» - (کرامت علی کرامت)، «گوری»، «جھولا» - (خالد محمود)
«ایک سہاگن جھولے پر»، «آم کا پیڑ میرے آنگن میں» - (بدیع الزماں خاور)
«ناچ ری برنگی»، «روپ رہس» - (سرمد صہبائی)، «کایا کا کرب» - (آفتاب اقبال شمیم)
«ارچنا»، «ھما ہوے یہ رات»، «راکھ اور سیندور» - (رؤف خیر)، «نیل کنٹھ»
«روح ہولی پھر گوتم کی» (راج نرائن راز)، «بدھم شرنم گچھا می» - (آشفتہ چنگیزی)
«دیو داس» - (صلاح الدین پرویز)، «آرتی»، «دو بیراگی» - (پریم وار برٹنی)
«اندر دھنش»، «ابھیشک»، «مرلی منوہر»، «دوسرا جنم» «آواگون» «آیود پوجا»
(فرحت کیفی)، «چتا» - (اسلم آزاد)، «ناٹک نظم» - (کرشن موہن)، «گرو»
«لہو سمر سیلاب آوا گمن»، «گاؤں»، «تالاب رہٹ راشن کارڈ» - (عادل منصوری)
«کاگا» - (محمد علوی)، «پتھر کی آتما»، «مٹس گندھا» - (عمیق حنفی)
«میں گوتم نہیں ہوں» - (خلیل الرحمن اعظمی) - «یاتری»، «پریت آتما»، «پشاچ نگری»
«آکاش میں شبد»، دو پرار تھنائیں» - (کمار پاشی)، «سنجوگ»، «مکتی» - (قاضی سلیم)

«نروان» ، «یاترا» ، «ملن» ، «پیپل» - (وزیر آغا) ، «ممتا» - (محسن بھوپالی)
«سورج داسی» - (محمود علی محمود) ، «مامتا» - (زاہدہ صدیقی)

جدید تر غزل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے خلیل الرحمن اعظمی نے لکھا ہے :

«جدید شاعر نے پرانی علامتوں کو اپنی ذہنی کیفیات کے اظہار کے لئے ناکافی سمجھ کر خود اپنے ماحول اور زندگی سے علامتیں وضع کی ہیں اور اس نے اس سلسلے میں خود اپنے حواس خمسہ کو رہنما بنایا ہے اس عمل میں اردو غزل اپنی دھرتی سے بہت قریب آگئی ہے۔ اس کی عجمیت جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ فارسی غزل کا چربہ سمجھی جاتی تھی، اب قریب قریب ختم ہوگئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اردو غزل کی تاریخ میں یہ ایک اگلا قدم ہے» (مضامین نو - ص ۸۴)

مجھے خلیل صاحب کے اس خیال سے سو فیصدی اتفاق ہے۔ ایک زمانے میں محمد حسین آزاد جیسے دیو قامت نقاد نے بھی غزلیہ شاعری کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا تھا کہ اردو فارسی کے پروں سے اڑتی رہی ہے اور اپنی جگہ انھوں نے سچ ہی کہا تھا بات یہ ہے کہ دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں غزل اپنے مزاج کے اعتبار سے غنائی اور داخلیت پسند ہے اسلیے اس میں خارجی عناصر کی آمیزش نسبتاً کم ہوتی ہے لیکن اس کمی کا ازالہ نئی غزل کے ہاتھوں ہوگیا ہے آج کی غزل میں ہندوستانی اساطیر، تاریخی واقعات، دیہات کے مناظر، مقامی حالات، جغرافیائی اثرات سے لیکر موجودہ ترقی پذیر مشینی نظام تک ہندوستانی زندگی کے سبھی پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ ماحول و معاشرے، تہذیب و تمدن، رسوم و عقائد، رہن سہن، توہمات و عقائد، زیورات و ملبوسات، دیو مالائی اثرات اور مقامات کی جو جھلکیاں نئے شاعروں کے اشعار میں نظر آتی ہیں انھیں پہلی نگاہ میں دیکھ کر ہی ہندوستان سے منسوب کیا جاسکتا ہے اردو شاعروں کے سر بڑی آسانی سے یہ الزام منڈھ دیا جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں کوہ الوند، طور سینا اور بے ستون وغیرہ تو نظر آتے ہیں لیکن ہمارے ملک کے پہاڑ، دریا، جنگل اور تالاب وغیرہ کا کوئی ذکر ان کے ہاں نہیں ملتا نئی غزل نے اب ان عجمی تلمیحات و تشبیہات سے بڑی حد تک کنارہ کشی

اختیار کرلی ہے ۔ ان میں پرانی علامتوں کی تکرار اور گھسے پٹے تلازموں کی جگہ نئی نئی علامتیں نظر آنے لگی ہیں ۔ سورج ، دھوپ ، چاند ، شام ، پہاڑ ، صحرا ، دریا چراغ ، چہرہ ، پرچھائیں ، سمندر ، ہوا ، درخت ، پتے ، ریت ، سناٹا وغیرہ علامتیں نئی شاعری میں بکثرت برتی جاتی ہیں جن کی حیثیت عالمگیر ہے ۔ ان سے ہٹ کر خالص ہندوستانی پہاڑوں اور جنگلوں کا ذکر بھی نئی غزلوں میں نظر آتا ہے ۔ مثلاً :

آج کے بونے اڑاتے ہیں ہمالہ کا مذاق
راہ میں پتھر بہت ہیں سر کوئی اونچا نہیں (مظہر امام)

رخ پہ شوخی جھلکتی ہے شرمیلے پن میں
جیسے سنہری دھوپ کھلی ہو سندر بن میں (ظہیر فتح پوری)

اس نے اس انداز سے جھٹکا اپنے بالوں کو
میری آنکھوں میں در آیا پورا کجلی بن (مظفر حنفی)

تشبیہ و استعارے کی صورت میں اس طرح ہمالیہ ، سندر بن اور کجلی بن پرانی غزل میں ذرا کم ہی جگہ پاتے تھے ۔ غزل میں ہندوستان کے دریا بھی شاذ و نادر ہی نظر آتے تھے اور اگر کہیں ان کا ذکر آتا بھی تھا تو کچھ اس قسم کے دھمکی آمیز لہجے میں :

اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا (اقبال)

نئی غزل روزمرہ کی گفتگو کرتے ہوئے نارمل انداز میں گنگا اور جمنا کا ذکر کرتی ہے ۔ زندگی کے تضاد کو نمایاں کرنے کے لیے مثال پیش کرتے ہوئے نیا شاعر کہتا ہے کہ اسی جمنا میں جہاں دلہنوں کے سہرے ٹھنڈے کیے جاتے ہیں مرنے والوں کی لاش بھی بہائی جاتی ہے ۔ ایک غریبہ منظر پیش کرتے ہوئے مسجد کے منارے پر چیختے ہوئے پرندے کے ساتھ ہی گنگا کے کنارے اس کا سورج غروب ہوتے ہوئے دکھایا جاتا ہے اور ہجار میں بیٹھ کر گنگا کو یاد کیا جاتا ہے :

جہاں دلہن کا سہرا بہہ رہا ہے
اسی جمنا میں مردہ بہہ رہا ہے (مظفر حنفی)

ایک پرندہ چیخ رہا تھا مسجد کے مینارے پر
دور کہیں گنگا کے کنارے اس کا سورج ڈھلتا تھا (نور بجنوری)

اتنا دلِ نعیم کو ویراں نہ کر حجاز
روئے گی موج گنگ جو اس تک خبر گئی (حسن نعیم)

پیش رو غزلوں میں سمرقند و بخارا، دمشق اور بغداد کے ساتھ ساتھ مکہ اور مدینہ کو بھی یاد کیا جاتا تھا پر ہندوستانی شہروں کے نام بھی اردو شاعری کے لئے نئی چیز نہیں تھے اگر ولی نے سورت کی تعریف کی تو میر، ذوق اور کئی دوسرے شعرا کے ہاں دلی کا ذکر مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔ ناز نینان کلکتہ کی عشوہ طرازیاں غالب کی غزل کا موضوع بن چکی ہیں کبھی مجاز نے لکھنؤ کی تعریف میں اشعار کہے تو کبھی اقبال نے فرزندان علی گڑھ سے خطاب کیا، بمبئی کا ذکر بھی بہت سے شاعروں کے ہاں آیا اور کچھ شاعروں نے ارض دکن سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار بھی کیا ہے۔ صبح بنارس اور شام اودھ کے حسن و جمال کی تعریف و توصیف میں متعدد شاعروں کے اشعار ملتے ہیں نئی غزل نے اس صحت مند روایت کو کافی آگے بڑھایا چنانچہ کلکتہ سے متعلق تو باقاعدہ ایک طویل نظم "کلکتہ ایک رباب" (حرمت الاکرام) کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہے جس میں اس شہر کی زندگی اور مختلف معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں غزل کے اشعار میں متعدد شعرا نے اپنے تجربات کی روشنی میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے مثال کے طور پر چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔ جن میں کلکتہ، گوہاٹی، بھوپال، رام پور اور دہلی وغیرہ شہروں کا ذکر مختلف طرح سے آیا ہے۔ عادل منصوری کے شعر میں شہر کی جگہ ایک پورا صوبہ (گجرات) جگہ پا گیا ہے اور عمیق حنفی نے صبح بنارس اور شام اودھ کی فہرست میں شب مالوہ کو بھی شامل کردیا ہے۔ راقم الحروف کے ایک شعر میں ماتا ٹیلا کا تذکرہ ہے اشعار ملاحظہ ہوں:

دل سے دور ہوئے جاتے ہیں غالب کے کلکتے والے
گوہاٹی میں دیکھے ہم نے ایسے ایسے چہرے والے (مظہر امام)

اے مظفر کس لئے بھوپال یاد آنے لگا
کیا سمجھتے تھے کہ دلی میں نہ ہوگا آسماں (مظفر حنفی)

تغافل کمالِ فن مزاج رام پور ہے
تو مجھ سے بے رخی میں بزم دوست نے قصور ہے (شاد عارف)

اے صبا میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا
پوچھنا دلی کی گلیوں سے مرا نام کبھی (حسن نعیم)

عمیق چھیڑ غزل غم کی انتہا کب ہے
یہ مالوے کی حسیں چودھویں شب ہے (عمیق حنفی)

شہدوں کی شمعیں پگھلیں
لو خاموش ہوا گجرات (عادل منصوری)

سادھو بنا کر بیٹھ رہی
مانا ایلا کچھ تو کر (مظفر حنفی)

کچھ بھی ہوں دلی کے کوچے
تجھ بن مجھ کو گھر کاٹے گا (مظفر حنفی)

یوں بھی دلی میں لوگ رہتے ہیں
جیسے دیوان میر چاک شدہ (مظفر حنفی)

ان سے ہٹ کر وہ صدہا نظمیں اور غزل کے بے شمار اشعار ہیں جن کا موضوع حب الوطنی یا قومی یکجہتی ہے ایسی تخلیقات کی روشن مثالیں ماہنامہ « شاعر » بمبئی کے قومی یکجہتی نمبر میں مل سکتی ہیں۔

ہندوستانی سنگیت اور سازوں میں بھی وہ گنگا جمنی صورتحال نظر آتی ہے جو ہند ایرانی تہذیب کا خاصہ ہے۔ صدہا سال قبل ہندوستان آنے والے مسلمانوں کے ساتھ ایرانی اور ترک تہذیب اور رسم و رواج کے ساتھ ان کے مخصوص ساز بھی آئے تھے اور سیکڑوں سال کے تال میل سے ان سازوں نے نئی نئی صورتیں اختیار کی تھیں ہر چند کہ شرع کے اعتبار سے گانا بجانا مستحسن نہیں ہے لیکن صوفیوں نے سنگیت اور سازوں کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے اس ضمن میں امیر خسرو کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انھوں نے نہ صرف خود ان گنت راگ اور ساز ایجاد کیے بلکہ اپنی ادبی تخلیقات میں بھی ایرانی اور ہندی راگوں اور سازوں کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے کہا جاتا ہے کہ ستار امیر خسرو ہی کی دین ہے اس سے قبل یا تو ہندی ساز بین اور وینا ہوتے تھے یا ایرانی ساز عود یا طنبور تھے۔ انھیں ملا جلا کر امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا اسی طرح انھوں نے پکھاوج کی جگہ ڈھولک اور طبلے رائج کیے اور بہت سے ہندوستانی اور ایرانی راگوں کو آمیز کر کے قول

قلبانہ، نقش گل اور ترانہ راگ ایجاد کیے اسی طرح اردو کے بالکل ابتدائی دور سے ہی ہندوستانی سازوں کی گونج اس کے شعری ادب میں بھی سنائی دیتی رہی ہے۔ خالصتاً ہندوستانی سازوں کی جھنکار سے نئی غزل نے بھرپور استفادہ کیا ہے، چنانچہ مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے جن میں ظہیر غازی پوری کے ہاں آدمی جانجھ اور کاسے کے تھال کی طرح بجتا ہے تو زیب غوری کے شعر میں پانی ہوا کی تھاپ کھاکر کسی ہوئی مردنگ کی طرح آواز دیتا ہے اور لہر ترنگوں سے اکتارے کی جھنکار بلند ہوتی ہے سید افضل جعفری کے ہاں سپیرا کانوں میں بالے پہنے بین بجاتا ہے:

جدھر سے ٹھوکیے بجتا ہے جھانجھ کی مانند
اب آدمی بھی تو کاسے کا تھال لگتا ہے (ظہیر غازی پوری)

کسی ہوئی مردنگ سا پانی ہوا کی تھاپ سے بجتا ہے
لہر ترنگ سے الجھی ہے جھنکار کسی اکتارے کی (زیب غوری)

ہاتھ میں بین ہے کانوں کی لوؤں میں بالے
یہ ریاکار سپیرے کے سوا کچھ بھی نہیں (سید افضل جعفری)

موسیقی کی مختلف اصطلاحات اور راگ راگنیوں کا ذکر بھی اردو شاعری میں ہمیشہ سے رائج رہا ہے۔ «مثنوی سحرالبیان» ہو یا «گلزار نسیم»، سودا اور انشا کے قصیدے ہوں یا استاد ذوق کے، ہر جگہ موسیقی کی تانیں بلند ہوتی نظر آتی ہیں۔ مومن کے ہاں بھی اس عورتِ ناہید کی ناؤیں شعلوں کی طرح لپکتی دکھائی دیتی ہیں۔ نئی غزل اس میدان میں پیشرو شاعروں کی روایت پر اضافہ کررہی ہے اور اکثر غزل گویوں کے اشعار میں کہیں دیپک راگ سے چراغ جلتے نظر آتے ہیں تو کہیں برکھا رت میں تال سر کے ساتھ ملہاروں کی تانیں بلند ہوتی ہیں غرضیکہ ہندوستانی موسیقی کے ساتوں سر نئی غزل میں شامل ہیں:

ملہاریں گاتے ہیں مینڈک تال کنارے
آسمان پر بھورے بادل مٹک رہے ہیں (مظفر حنفی)

آنکھوں سے ابلے ہیں دریا دل میں لگی ہے آگ
برکھا رت میں چھیڑ دے جیسے کوئی دیپک راگ (حنیف کیفی)

ساتوں سروں کے راگ سے جلتی ہے دل کی آگ
ساد ھا میں بھی میرا شعلہ سنبھل گیا (شہاب جعفری)

ایسے درختوں اور پودوں کی بہار بھی نئی غزل میں نظر آتی ہے جو بالخصوص ہندوستان کی سرزمین پر پائے جاتے ہیں مختلف شعرا کے اشعار میں کہیں آپ کو چھتوں پر نیم کی ہری ہری شاخیں گھٹاؤں کی طرح جھومتی نظر آئیں گی ، کہیں نیم کے پتوں کی تلخی کا ذکر ملے گا ، کہیں بیمو کی کیاری کا منظر سامنے آئے گا ۔ پیپل کی بلندی ، اس کی گھنی چھاؤں کا تذکرہ بھی نئی غزل میں اکثر کیا گیا ہے آم تو بطور خاص ہندوستانی درختوں کا سرتاج ہے چنانچہ شاعروں نے اس سے اکتساب فیض کیا ہے چنار کی شاخیں ، کیکر اور جامن کے درخت ، ببول اور شہتوت بھی نئے غزلگویوں کی فکر کا موضوع بنے ہیں ۔ دوج کے چاند کی روشنی میں چمکتے ہوئے پانی کے کنارے باس کے جھنڈ بھی غزل کے اشعار کے پردے پر منعکس ہوئے ہیں ناگ پھنی اور بیر کے پودے ، بھینی بھینی خوشبو دینے والے مہوے کے درخت ، ندیوں کے کنارے کھڑے ہوئے شیشم کے تناور پیڑوں کے خوشنما منظر نئی غزل میں جابجا نظر آتے ہیں اور صندل کے پودوں کی سنہری جھلک بھی نظر آتی ہے ۔ کہیں کیلے کے پودے جھوم جھوم کر بلاتے ہیں تو کہیں سپر یری کی طرح اس کے چوڑے اور لمبے پتے اپنے پر پھیلائے دکھائی دیتے ہیں ۔ شریفے بھی اس ہندوستانی فضا کی تکمیل کرتے ہیں ۔ برگد تو ہمارے ملک کا وہ چھتنار درخت ہے جس کے سائے مذہب سے لیکر ادب تک دور دور تک پھیلے رہے ہیں چنانچہ نئی غزل بھی اس کی خنک چھاؤں سے محروم نہیں رہی اس قسم کے چند مناظر سے آپ بھی لطف اندوز ہو ایں جہاں نئی غزل کے باغ میں یہ درخت اور پودے اپنے تلازمات کے ساتھ لہلہاتے نظر آتے ہیں ۔

تلخیاں نیم کے پتوں کی ملی ہیں ہر سو
یہ مرا شہر کسی پھول کی خوشبو بھی نہیں (زبیر رضوی)

سمٹی ہوئی چوکھٹ پر اک دھوپ کی بلی سی
بیمو کی کیاری میں چاندی کے کئی کنگن (فدا فاضلی)

جگمگاہٹ سے پروں کے لچک اٹھی تھی شاخ
پھر گھنا پیپل اسی ظلمت میں ڈوبا جا رہا (ذیب غوری)

بچپن میں آکاش کو چھوتا سا لگتا تھا
اس پیپل کی شاخیں اب کتنی نیچی ہیں　　(مظفر حنفی)

اسی آم کی کوکھ سے ایک دن میرا بھولا پن ابھرا تھا
اسی آم کی جڑیں کھود کر اک دن اپنا بچپن ڈھونڈوں
یارو میرے پاگل پن کا سچ مچ کوئی علاج نہیں ہے
نیم نیم پر کوپل چاہوں کیکر کیکر جامن ڈھونڈوں　　(کمل کرشن اشک)

چنار شاخ زر نگار دھوپ میرے ساتھ تھی
حصار سنگ و در بنا زمین سخت ہو گئی　　(زیب غوری)

شاخیں بہت قریب تھیں شہتوت کی مگر
اپنی کرامت ڈوب گئی نیم کے تلے　　(احمد عظیم آبادی)

پھولوں کا یہ جنگل ہے یہاں گل کی توقع کیا
غنیمت جانیے کانٹوں سے دامن کا بچا رہنا　　(محسن زیدی)

سادہ کاغذ کی کہانی کا پس منظر ہیں
دوج کا چاند ، ہرے بانس چمکتا پانی　　(مظفر حنفی)

بیساں میں کوئل کہیں کوکتی ہے
پھولوں پہ بلبل کہیں بولتا ہے　　(شاد عارفی)

اہلِ ہنر ملامتِ دنیا کا غم نہ کر
بیری اگر ہے گھر میں تو پتھر بھی آئیں گے　　(خالد محمود)

دوپہر ہونے کا تصور جاگے
اب اگر ناگ پھنی کو دیکھوں　　(ساحل احمد)

بھینی بھینی مہوا کی بو دور گاؤں سے آتی ہے
بھولی بسری کوئی کہانی بس بس آگ لگاتی ہے　　(شمیم انور)

مرے شیشموں کی چھاؤں میں ہیں دھوپ کے ٹھکانے
مری ندیوں کی لہروں میں ہے آگ کا بسیرا　　(سید افضل جعفری)

صندل جیسی رنگت پر قربان سنہری دھوپ کروں
روشن ماتھے پر واروں میں سارا حسن خدائی کا　　(عرفانہ عزیز)

برگد کی چھاؤں میں راہی پل دو پل کو بیٹھ گئے
پتوں کے درمیان سے آ کر لگا گئی پھلواری دھوپ　　(خالد محمود)

جھوم کر کیلے کے پودے نے بلایا تھا ہمیں
وہ بھی نکلا کونلے کی گرد میں لتھڑا ہوا (مظفر حنفی)

کیلوں کو شمیم چمن آرا کے جھکولے
سمٹے ہوئے پر کھول دئیے سبز پری نے (شاد عارفی)

ہوا کی تال پہ کیلے کی ڈال جھوم رہی ہے
تمام سرو بدن روپ کے بہاؤ کا عالم (طہیر فتح پوری)

شریفے کے درختوں میں چھپا گھر دیکھ لیتا ہوں
میں آنکھیں بند کر کے گھر کے اندر دیکھ لیتا ہوں (محمد علوی)

دیکھوں تو مرے جسم پہ شاخیں ہیں نہ پتے
سوچوں تو گھنا چھاؤں میں برگد سے زیادہ (اقبال ساجد)

چنتی رہیں عقیدتیں تیری اچھائیوں کے پھول
ہم نے تری برائی کے دیکھے نہیں ببول ابھی (ریاض مجید)

ہندوستانی فصلوں کا ذکر کرنے سے پہلے لگان ادا کرتے چلیں۔

جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے
میں اس کا لگان دے رہا ہوں (سلیم احمد)

اور اب ملاحظہ فرمائیے دھان کے کھیتوں میں چہچل پنچھیوں کے شور سے ایکر جو، گندم، سرسوں، کپاس کی فصلیں تو نئی غزل میں موجود ہیں ہی ان کے ساتھ ژالہ باری، برفباری اور خشک سالی کے تلازمات بھی لگے ہوئے ہیں

کچھ مدھر تانیں فضا میں تھرتھرا کر رہ گئیں
دھان کے کھیتوں میں چہچل پنچھیوں کا شور تھا (عبدالرحیم نشتر)

اگر جو بیچنے والوں کے چہرے لکھ لیے جائیں
ہمارے ملک سے گندم نمائی ختم ہو جائے (شاد عارفی)

موسم نے کھیت کھیت اگائی ہے فصل زرد
سرسوں کے کھیت ہیں کہ جو پیلے نہیں رہے (مظفر حنفی)

نور کے تڑکے میں نے دیکھی پنکھڑیوں پہ اوس
تاروں کے موتی چنتی ہے ساری رات کپاس (عرفانہ عزیز)

خواہشوں کی برف کرچوں سے چھدی فصل بدن
ژالہ باری نے پکی فصلوں کو دہرا کردیا (ریاض مجید)

چپکے چپکے کیا کہتے ہیں تجھ سے دھان کے کھیت
بول ری نرمل نرمل ندیا کیوں ہے چاند اداس (عرفانہ عزیز)

خشک سالی کھا گئی افراد کو
بہہ گئے گھر بھی جو برسا ٹوٹ کر (خالد محمود)

سوسن، یاسمن، نرگس اور گلاب وغیرہ ایرانی نژاد پھولوں سے تو ہماری غزل اپنی ابتدا سے ہی عطر بیز رہی ہے۔ اب اس میں ہندوستانی پھولوں کی مہک زیادہ تیز ہوگئی ہے۔ نئے غزلگویوں کی فکر کے آنگن میں رات کی رانی نہ صرف خوشبو دیتی ہے بلکہ ہندوستانی روایت کے مطابق اس کے آس پاس سانپوں کا خدشہ بھی منڈلاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ رات کی رانی کے ساتھ خاکستر جاں کو مہکانے والی جوہی کے پھول بھی اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ نئی غزل میں موجود ہیں۔ ہندوستان کا قومی پھول کنول طرح طرح سے نئے اشعار میں جلوہ گر ہوا ہے اور سورج مکھی کی موجودگی بھی شعروں میں ہندوستانی فضا کو ابھارتی ہے کئی شاعروں کے ہاں سرسوں کے پیلے پیلے پھولوں کے ذکر سے رنگینی خیالی کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے، مثالیں دیکھیے۔

دل کے آنگن میں ابھرتا ہے ترا عکس جمیل
چاندنی رات میں ہو رات کی رانی جیسے (عرفانہ عزیز)

باد شام آئے مہک اٹھے مرا صحن ریاض
یہ مہک جھاڑیوں سے رات کی رانی نکلے (ریاض مجید)

اب انھیں تشریف لانا چاہیے
رات میں کھلتی ہے رانی رات کی (شاد عارفی)

آنگن میں یہ رات کی رانی سانپوں کا گھر کاٹ اسے
کمرہ البتہ سونا ہے کونے میں گلداں لگا (مظفر حنفی)

خاکستر جاں کو مری مہکائے تھا لیکن
جوہی کا وہ پودا مرے آنگن میں نہیں تھا (زیب غوری)

وقت کا دریا کہ میں جس میں کنول بن کر کھلا
سوچیے تو بحر ہے اور دیکھیے تو آب جو (عارف عبدالمتین)

بے نور تھی جمیل بھی کنول سے
سورج بھی جلا میں مر گیا تھا (عادل منصوری)

گھر گھر کھلے ہیں نار سے سورج مکھی کے پھول
سورج کو پھر بھی مانع دیدار کون ہے (شمس الرحمن فاروقی)

اور ان ہندوستانی پھولوں کے ساتھ ساتھ سبزہ بھی ہندوستانیت سے بیگانہ نہیں رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے نصیر پرواز کے مندرجہ ذیل شعر میں یہ کچی دوب کیسا لطف دے رہی ہے :

بہار سادگی صد کررہی ہے
میں کانٹوں کو بھی کچی دوب لکھ دوں (نصیر پرواز)

پرانی غزل کے پروانے کی جگہ نئی غزل میں جگنو نے لے لی ہے پیشروؤں کی غزل میں بلبل ہزار داستاں اور طوطئی شکر مقال کے تعلق سے اشعار کی افراط ہوا کرتی تھی نئی غزل نے اس میدان میں قدم کافی آگے بڑھائے ہیں۔ اس میں ہرنوں کی قلانچوں کے ساتھ جنگل میں ناچتے ہوئے مور بھی ملتے ہیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر گلہریاں بیٹھی دکھائی دیتی ہیں، درختوں پر کوئلوں کی کوک سنائی دیتی ہے۔ جھیلوں پر مرغابیوں کے پہرے ڈولتے ہیں ہرے ہرے پتوں میں پھدکنے والے سبز طوطوں کا رنگ گڈ مڈ ہوتا نظر آتا ہے، کہیں مٹھو میاں پڑھتے نظر آتے ہیں تو کسی جگہ مینا پنجرے میں ناچتی دکھائی دیتی ہے، کہیں دریا کنارے کونجیں ماہیا گاتی ہیں۔ دوپہر میں حسن زدہ چیل چیختی ہے تو رات کو ابابیل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے پپیہے کی پی کہاں بھی نئی غزل میں گونجتی ہے، ذرا یہ شعر دیکھئے:

شوخ ہرنوں نے قلانچیں ماریں
مور کے رقص ہوئے جنگل میں (محمد علوی)

مرے خیال کے جگنو بھی ساتھ چھوڑ گئے
اداس رات کے سونے کھنڈر میں تنہا ہوں (مخمور سعیدی)

یاد کی برف پوش چوٹی پر
اک گلہری اداس بیٹھی ہے (بشیر بدر)

سب اپنے گھروں میں تان کے بادل سوتے ہیں
اور دور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے (ناصر کاظمی)

آنکھ مشکل ہی سے کر پاتی ہے دونوں کو الگ
رنگ طوطوں کا ہرے پتوں سے ملتا جارہا (رب عوری)

ماہیا گائیں گی کونجیں اب دریا لیکن
ان کے سنگیت میں وہ بات کہاں تیرے بعد (سید افضل جعفری)

دن چینختا ہے جنس زدہ چیل کی طرح
پر مارتی ہے رات ابابیل کی طرح (مظفر حنفی)

ان غم کی گھٹاؤں میں پپیہے کی صدا پر
محسوس یہ ہوتا ہے کہ جھک مار رہا ہے (شاد عارفی)

بوڑھا طوطا بولے گا
قیدی مینا ناچے گی (ساحل احمد)

کسی ملک کی انفرادیت کو نمایاں کرنے میں اور وہاں کے سماج کے ذہنی رویے اور مزاج کی تشکیل میں اس کے پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں، پودوں، پھولوں، پرندوں جانوروں، فصلوں وغیرہ کے علاوہ وہاں کے مخصوص جغرافیائی حالات، موسم، رسم و رواج، تیوہاروں، پیشوں، سماجی تقریبوں، عقیدوں، مذہبوں اور دیو مالا وغیرہ کے گہرے اثرات کارفرما ہوتے ہیں اور یہ اثرات اس ملک و قوم کے ادب میں کہیں براہ راست بیانیہ انداز میں کہیں تشبیہ و تلمیح کے توسط سے اور کہیں استعارہ اور علامت بن کر نمایاں ہوتے ہیں ان میں سے چند پہلوؤں کے نمونے پیش کیے جا چکے ہیں ہندوستان کے مخصوص موسموں کی نمائندگی اردو کی نئی غزل میں بھر پور طریقے پر ہوئی ہے جیسا کہ آپ اگلے پیش کردہ اشعار میں ملاحظہ فرمائیں گے۔
بسنت کی رت میں دھانی ساریوں کی بہار نے بھی ہمارے شعرا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے اور یہاں کے اماوسوں نے بھی ان کے دامن خیال کو کھینچا ہے۔
کہیں آپ کو ابتدائی گرمیوں کے کھلتے ہوئے دنوں کی خوشگوار دھوپ پھیلی نظر آئے گی تو کہیں موسم برشگال کی دھوپ کی شدت کا احساس ہوگا کہیں برکھا رت میں موسلا دھار برسات کا منظر جھلکتا دکھائی دیگا تو کہیں چیت کے بادلوں تلے سرسوں کے پھولوں سے اٹے ہوئے پیلے کھیت پھیلے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہاں میں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ اردو زبان نے آنکھیں کھولتے ہی بارہ ماسہ جیسی خالصتاً ہندوستانی صنف سخن سے شناسائی کرلی تھی۔ یہ بارہ ماسی کیفیت نئی غزل کی ایک

نمایاں خصوصیت ہے۔ اکثر اشعار میں بدلتی ہوئی رتوں میں فراق زدہ چاہنے والوں کے دلوں کی کیفیات کی عکاسی اس فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ نظر آتی ہے اور ان پر ہندوستانیت کا اتنا واضح ٹھپہ لگا ہوا ہے کہ بے ساختہ منہ سے واہ نکلتی ہے۔ کہیں چیت میں چیتاوں بھیجنے کا ذکر ملتا ہے تو کہیں پت جھڑ کی رت میں وچن یاد دلایا جاتا ہے۔ کسی شعر میں دھول بھری دکھنی ہوا اس تیزی سے چلتی ہے کہ درختوں کی شاخیں کڑکڑانے لگتی ہیں اور کہیں پروائی کے وسیلے سے کھیتوں پر بادلوں کو نظر کرم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے، کسی شعر میں ساون میں محبوب کی جدائی کا احساس شدید ہوتا نظر آتا ہے تو کہیں جاڑوں کی رتوں میں آبی پرندے سرسبز و شاداب چاول کے ریرے چنتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چند نماطر پیش خدمت ہیں۔

دھانی ساری پہن کے آئی
رت بسنت کی پہلی کونپل (خالد محمود)

اک اماوس کا نصیبا ہوں میں
آج یہ چاند کدھر سے نکلا (اختر امام رضوی)

اترتی ذہن میں تھی خوشگوار دھوپ کبھی
شروع گرما کے کھلتے ہوئے دنوں کی طرح (ریاض مجید)

مدتوں کے بعد جی چاہا تھا چھت پر سوئیے
رات پہلو میں نہ آئی تھی کہ بوندیں آگئیں (رہبر رضوی)

دھوپ ساون کی بہت تیز ہے دل ڈوبتا ہے
اس سے کہہ دو کہ ابھی گھر سے نہ باہر نکلے (احمد مشتاق)

دل سلگتا ہے تری چشم کرم کی چھاؤں میں
یہ زمیں پیاسی بہت پیاسی بھرے ساون میں ہے (مخمور سعیدی)

لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو (منیر نیازی)

دل کے صحرا پہ برس چیت کے بادل کی طرح
خشک ٹیلوں کو بھی دے پھولتی سرسوں کا مزاج (سید افضل جعفری)

چیت آیا چیتاؤنی بھیجی اپنا وچن نبھا
پت جھڑ آئی پتر لکھے آ جیون بیت چلا (مجید احمد)

راہیں دھڑکیں شاخیں کڑکیں اک اک ٹیس اٹھی
کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھیا (مجید امجد)

کھیتوں پہ ابر لیکے یہ پروائی جائے گی
مدلی سمندروں پہ ہی برسائی جائے گی (مظفر حنفی)

سونے ساون میں ستائے گی بہت پروائی
درد کو دل میں مگر اپنے دبائے رکھنا (عبداللہ کمال)

اب کے بھی چار ماہ کے بادل برس گئے
کیا جانے کس جہان میں تم جاکے بس گئے (خالد محمود)

مجھے سبز و شاداب چاول کے ریزے ابھی اور چننے دو ان وادیوں میں
میں آبی پرندہ ہوں جاڑوں کی رت کا یہ موسم جو گذرا گذر جاؤں گا میں
(مشتر خانقاہی)

کسی ملک کے تیوہار بھی اس کے کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں یہاں کے مختلف فرقوں کے تیوہاروں کا ذکر اتنی کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے اور ان پر مشترک ہندوستانی کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کے لیے زیادہ نمونے پیش کرنا تحصیل حاصل کے مترادف ہوگا۔ عید، شب برات، محرم وغیرہ سے متعلق اشعار ابتدا سے ہی نظموں اور غزلوں میں ملتے رہتے ہیں۔ یہی حال دیوالی دسہرہ، گنگا اشنان، درگا پوجا، ہولی وغیرہ کا ہے۔ نئی غزل بھی اکثر ہندوستانی تیوہار مناتی ہے۔ کبھی رنگ چھڑکتی رت میں نیا شاعر اپنی چاہت کا کشکول لیکر ان سوانگ رچانے والے فقیروں کی طرح در در پہنچتا ہے جو ہولی کے موقع پر ہندوستان کے قریہ قریہ اور کوچے کوچے میں نظر آتے ہیں۔ کہیں سبز در سبز درختوں میں آگ کا پھاگ کھیلا جاتا ہے، کہیں رنگ برنگ کے اتنے چھینٹے پڑتے ہیں کہ غزل گو نئے کپڑے پہن کر باہر نکلنے سے گریز کرتا ہے تو کسی فنکار کی محبوبہ دور سے اسے گلال دکھاکر خود اپنے چہرے پر مل لیتی ہے۔ ہولی کی ان رنگا رنگ تصویروں کے ساتھ جدید غزل دیوالی کے چراغاں سے جگمگ جگمگ بھی

کرتی ہے چنانچہ کسی شعر میں تیرہ مکان اچانک جگمگا اٹھتا ہے اور انار کے چھوٹنے کے منظر سے شراروں کے فوارے سے بلند ہوتے نظر آتے ہیں ، کہیں رات نابینا بتوں کے آگے اپنی تھالی چراغوں سے سجا کر لے جاتی ہے اور ہمیں لکشمی پوجا کی یاد دلاتی ہے اور اس خوبصورت تیوہار کی یاد میں اکثر ساون کے موقع پر بادل پھلجھڑیاں چھڑاتے ہوئے بھی پائے جاتے ہیں چند مناظر اتنے خوبصورت ہیں کہ آپ کو ان سے محروم رکھنا ظلم کے مترادف ہوگا لہذا پیش ہیں :

ایک سمے سے ہاتھ میں تیری چاہت کا کشکول دیا
رنگ چھڑکتی رت نے ہم کو تیرے در کا فقیر کیا　　(ریاض مجید)

سر در سبز درختوں میں چلا آگ کا بھاگ
اجلا اجلا ہے مرے خواب کی تعبیر کا رنگ　　(مختار شمیم)

وہ رنگ رنگ کے چھینٹے پڑے کہ اس کے بعد
کبھی نہ پھر نئے کپڑے پہن کے نکلا میں　　(انور شعور)

میں دور تھا تو اپنے ہی چہرے پہ مل لیا
اس زندگی کے ہاتھ میں جتنا گلال تھا　　(امیر آغا قزلباش)

وہ ریت تیرہ مکانوں کا جگمگا اٹھنا
بلند ہونا تو فوارہ سا شرارے کا　　(ریب غوری)

خاک انصاف ہے نابینا بتوں کے آگے
رات تھالی میں چراغوں کو سجا کر لے جائے　　(بشیر بدر)

جب پتیوں جھاڑوں نے اپنی تباہی سمیٹ لی
تھی بادلوں کے ہاتھ میں ساون کی پھلجھڑی　　(علیم صبا نویدی)

اور مندرجہ ذیل اشعار بھی ملاحظہ فرما لیجیے :

مصور آج بھی کھینچتا ہے تار تار سا جسم
نہ جانے کون سی انٹی پہ کت کے سوت ملے　　(مصور سبزواری)

بلبل زرد چھچھوندر کے گدے تلوے سہلائے
مینا گھر گھر برتن دھوئے کوئلے چاول دھان　　(بشیر بدر)

پھول مرجھا نہ جائیں صحروں میں
سانجھ بو کوئی گیت ساحل کا　　(مجید امجد)

لایا کیا کیا گھر سوچ ساگر سے سپنوں کا ماجھی
مل گئیں کتنی کھوئی ہوئی کشتیاں رات بھر میں　(حسن اختر جلیل)

پیار کی آنکھیں بند جائیں گی دل کا دیا بجھ جائے گا
کب تک لہو جلاؤ گے تم کب تک کاجل پاروگے　(سجاد باقر رضوی)

گرم ہوا کے جھونکے آکر چونکا دیتے ہیں
ما کیا ناپ رہا ہے آری ندیا جاری دھوپ　(خالد محمود)

اس طرح اٹی پر سوت کاتنے ، دھاں کوٹنے جانے ، ساحلوں پر ماجھیو کے گیت گانے اور بچوں کو لوریاں سنانے سے ہندوستانی تہذیب کے نئے نئے رخ سامنے آتے ہیں ، نئی غزل میں دل کے دئیے میں لہو جلا کر کاجل پارنے کا خالصتاً ہندوستانی عمل بھی نظر آتا ہے ۔

ایسے اشعار کی کمی بھی نئی غزل میں نہیں ہے ۔ جن سے ہندوستانی کھیل تماشوں اور تفریحی مشغلوں کے توسط سے اس ملک کی متحرک اور گہماگہمی سے لبریز معاشرت کے مرقعے ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں آئیے ایسی کچھ تفریحات میں شرکت کریں ۔

آسماں دل کا پڑا ہے خالی
زخمی یادوں کے کبوتر ہی اڑاؤں　(مخمور سعیدی)

اک خلائے بے کراں ہے اور دارو مار ہا
درمیاں ہے رات چھتری سے کبوتر دور ہے　(مظفر حنفی)

اپنے شہ شطرنج کو خود گھیر لیا ہے
پیدل بھی نہیں ہیں جو سواروں کی طرح ہیں　(مظفر حنفی)

میں نے چاہا تھا کہ پر کاٹ دوں جن لمحوں کے
اڑ گئے وقت کی مٹھی سے کبوتر کی طرح　(مخمور سعیدی)

وہی روش نشان کوبکو سے دوستی کی ہے
کٹی ہوئی پتنگ جو بھی لوٹ لے اسی کی ہے　(شاد عارفی)

وہ ڈور ہے تو مرے ہاتھ میں رہے گا سدا
پتنگ ہے تو ہوا میں اسے اڑاؤں گا　(عبدالرحیم نشتر)

پاؤں پاؤں مڑتی پگڈنڈی آنکھ جھپکتے ڈس لیتی
جیون کی ناگن کس کے بس اس کا کون سپیرا ہوگی　(بمل کرشن اشک)

نارو نل کھاتے ناگوں کا کون ہے جو سپیرا ہو
دیکھوں جھک کے آنکھوں میں زہر بھی ہو تو میرا ہو (شمس الرحمن فاروقی)

ان کے جانے کی تاریخ
دنگل تھا جب گاؤں میں (ندا فاضلی)

کھیلتی کودتی ساون کی رتوں میں تنہا
کون اکاش میں اڑتے ہوئے جھولوں سے ملے (عبدالرحیم نشتر)

انساں ناچتا ہے یہاں پتلیوں کے رنگ
دنیا میں آگیا ہے تو اس کے مزے بھی دیکھ (شکیب جلالی)

بھنور بھنور مرے دل کے لیے ہنڈولا ہوا ہے
ترے سبھاؤ ترے پھول سے سبھاؤ کا عالم (ظہیر فتحپوری)

سن ری سجریا رس کی گگریاں کل گاؤں کے میلے میں
دور دیس کا اک پردیسی تجھ پر تن من ہار گیا (ناصر شہزاد)

یوں کبوتر باروں کے ساتھ یہ غزل کہیں کبوتروں کے پر کاٹنے کی فکر کرتی ہے اور وہ مٹھی سے اس طرح اڑ جاتے ہیں جیسے جہانگیر کے کبوتر کبھی مہرالنساء نے اڑا دیئے تھے کبھی دل کے آسمان پر یادوں کے رحمی کبوتروں کی پرواز دیکھ کر طبیعت بہلائی جاتی ہے۔ یہ کبوتر کھلی چھت پر نصب ہوئی چھتریوں کے اوپر اترتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ کسی شعر میں شطرنج کی بساط پر شہ شطرنج اپنے ہی مہروں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں کٹی ہوئی پتنگ کو لوٹنے کے سلسلے میں اس اصول کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ وہ جس کے ہاتھ آجائے، بتاں کوبکو کی طرح اسی کی ہو جاتی ہے۔ کسی کے ہاں یہی پتنگ سیدھے سبھاؤ ڈور کے سہارے اور ہاتھ کے اشارے پر اڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں سپیرے ناگن کا ناچ دکھلاتے ہیں تو کسی شعر میں نل کھاتے ہوئے ناگوں کی آنکھیں دیکھ کر ان کے زہر کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہیں گاؤں میں دنگل ہوتا ہے تو کہیں کٹھ پتلیاں ناچتی دکھائی دیتی ہیں کسی جگہ ہنڈولوں سے لطف لیا جاتا ہے کہیں ساون میں جھولوں کی پینگیں اٹھتی ہیں کہیں گاؤں کے میلے کی گہما گہمی میں پردیسی کسی سجنی پر تن من ہار جاتا ہے۔ یہ تمام اشعار اس دھرتی کی سوندھی سوندھی مہک میں رچے بسے ہوئے ہیں جس سے ان کے تخلیق کاروں کا خمیر اٹھا ہے۔

شادی بیاہ کی تقریبات اور ان سے متعلق رسوم و رواج بھی ثقافت اور تمدن کے جزو لاینفک ہوتے ہیں قدیم اردو شاعری میں بطور خاص مثنویاں ایسی تقریبوں اور ان کی تفصیلات سے مملو رہی ہیں اور نئی غزل نے ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان تقریبوں میں جو رسمیں اور نیگ وغیرہ کی تصویریں نظر آتی ہیں وہ کسی مخصوص طبقے یا فرقے سے تعلق نہیں رکھتیں ان میں سے بیشتر اپنی گنگا جمنی خصوصیت کے تحت ہندوستان کے مختلف فرقوں اور علاقوں میں ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ رائج ہیں نئی غزل کے اشعار دیکھئیے کس طرح پکار پکار کر اپنے ہندوستانی نژاد ہونے کا اعلان کرتے ہیں :

آرزو کے منڈپ میں بے بسی کے پھیرے میں
زندگی کے دیوانے زندگی کو گھیرے ہیں (خالد محمود)

گیت بابل کے سنانے تیری سکھیاں آگئیں
میں ترے بچپن کا اک ٹوٹا کھلونا ہوگیا (مصحف اقبال توصیفی)

مانگ میں سیندور بھر کر چاندنی سوتی رہی
اور میں رستے میں کرنیں ڈھونڈتا پھرتا رہا (کمل کرشن اشک)

کیا تماشا ہے کہ بے ایام گل
ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہوگئے (ناصر کاظمی)

کچھ یونہی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا (کشور ناہید)

دور تک کوئی نہ آیا ان رتوں کو چھوڑنے
بادلوں کو جو دھنک کی چوڑیاں پہنا گئیں (زبیر رضوی)

درد کے ضامن کہاروں کا سمیلن ہوگیا
آرزوؤں کی سنہری پالکی سے منسلک (ساجد اثر)

ساجدہ یہ بھی اک روز کر جاؤں گا
وقت کی پالکی سے اتر جاؤں گا (مظہر امام)

اٹھ گئی رات چاند کی ڈولی
کتنی ویران ہے رات کی جھولی (رشید قیصری)

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں (بشیر بدر)

الفاظ نظم کا گھونگھٹ تو سامنے تم ہو
غزل کہوں تو تمہاری چھوی ہی بن جائے (مصحف اقبال توصیفی)

یادوں سے کہو سولہ سنگار آج کر آئیں
آئینہ بکف حسرت دیدار کھڑی ہے (وحید اختر)

سوچتے ہونٹوں پہ ہے پانوں کی آگ
بن رہے ہیں پھول ارمانوں کی آگ (سید افضل جعفری)

تو نے تاروں سے شب کی مانگ بھری
مجھ کو اک اشکِ صبح گاہی دے (ناصر کاظمی)

قرمزی ساری پہن کر اس طرح سجتی ہے وہ
پھول اپنے سر کٹا دیں چاندنی قربان جائے (مظفر حنفی)

مالی خود پھولوں کو نوچیں چور ہی جب نگراں بن جائے
ماتھوں کے نام پہ یارو کس کے ماتھے تلک لگائیں (خالد محمود)

یہ منڈپوں کے پھیرے ، سکھیوں کی ٹولی کا بابل کے گیت گانا ، مانگ میں سیندور بھرا جانا ، پیلے ہاتھ ، ہلدی ملنے سے بدن کا زرد ہونا ، اوڑھنی کا کھلتا ہوا رنگ ، دھانی چوڑیوں کی بہار ، کہاروں کا ہجوم ، سنہری پالکی اور چاند جیسی ڈولی گھونگھٹ میں شرمائی سی سہاگنیں ، وہ ان کے سولہ سنگار ، سہانے لبوں پر پانوں کی سرخی کا آگ سا دمکنا ، بالوں میں افشاں کا تاروں کی طرح جھلملانا ، قرمزی ساریوں کی چھوٹ اور ماتھوں پر لگائے جانے والے ٹیکے سبھی ہماری معاشرت کے نقیب ہیں ۔

یہ تو شادی بیاہ کی تقریبات سے متعلق باتیں تھیں ان سے ہٹ کر بھی مختلف مواقع پر جو رسمیں ہمارے ملک میں مستعمل ہیں اور بھانت بھانت کے عقیدوں کی آمیزش نے ہماری مشترکہ تہذیب کے دامن میں جو گل بوٹے کھلائے ہیں ان کی کچھ جھلکیاں ان اشعار میں نظر آتی ہیں

گاؤں کی اور چلی دھوپ دوشالہ اوڑھے
تاکہ باغوں میں ٹھٹھرتے ہوئے پھولوں سے ملے (عبدالرحیم نشتر)

گذاری تھی ترے ہجر کی پہاڑ سی رات
میں تار ریشم و زر کا دو شالہ کیا کرتا　　(ناصر کاظمی)

لوٹ کر آؤں گا پھر گاؤں تمہارے اک دن
اپنے دروازے پہ اک دیپ جلائے رکھنا　　(عبداللہ کمال)

میری نظر کے پاؤں چھوتے کائنات تھی
اپنی ہے سانسیں سانے میں جس کے حیات تھی　　(علیم صبا نویدی)

یہ بات کیوں کہی مجھ سے سکوت دریا نے
چراغ پانی میں اکثر بہائے جاتے ہیں　　(بشیر بدر)

نیند میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں گنوا کر اس کو
صدقۂ خواب اتارا نہ تھا پا کر اس کو　　(سلطان اختر)

خاک ہیں اب تری گلیوں کی وہ عزت والے
جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے　　(شہزاد احمد)

سونے کے سات کیل گڑے تھے نگاہ میں
ریشم کا ایک ڈھیر پڑا تھا پلنگ پر　　(ظفر اقبال)

احساس کی پلکوں پہ تھا مخمور اک قطرہ لہو
یادوں کے مرقد پر گرا پھولوں کی چادر ہو گیا　　(مخمور سعیدی)

آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی
اپنی چتا میں اپنے آپ کو جب ہم نے جلتے دیکھا　　(خلیل الرحمن اعظمی)

چتا کی راکھ ہوں کیا مجھ میں چن رہا ہے تو
اٹھا سکے تو مرے استخواں سے آگ اٹھا　　(مصور سبزواری)

درد کی شاخ تہی کاسہ میں اشکوں کے نئے پھول کھلے
دل جلی رات نے پھر مانگ بھری ہم نفسو شکر کرو　　(ناصر کاظمی)

پھر دئیے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں
آج دروازۂ دل کھلا دیکھ کر　　(بشیر بدر)

ایسا بھی کیا پیار کہ جس سے کل دنیا پیلی پڑ جائے
کیسر آنچل آنچل دیکھوں ہلدی دامن دامن ڈھونڈوں　　(نمل کرشن اشک)

زیب نہ بن نقال آئینہ حیق جاگتی آنکھیں کھول
اپنا ذہن اتار کے رکھ دے رنگوں کی اس تھالی میں　　(زیب غوری)

جلائیں گے یہ جی کو اور فکری
یہ سوکھے پھول دریا میں بہا دیں　　(پرکاش فکری)

اس چرخ کی تقدیس کبھی رات کو دیکھو
یہ قبر پر پھیلی ہوئی چادر کی طرح ہے　　(اختر امام رضوی)

خواب ان آنکھوں سے اب کوئی چرا کر لے جائے
قبر کے سوکھے ہوئے پھول اٹھا کر لے جائے　　(بشیر بدر)

چلے ہیں رردئ رح کاسۂ صدا لے کر
ڈھلا جو دن تو کسی سادھو کا بھبھوت بنے　　(منصور سرواری)

اگر جلانا نہ ہوتا یہ پیکر خاکی
وہ میری راکھ میں اپنے شرار کیوں رکھتا　　(باقر مہدی)

یوں ہی رہے گی وہ خواہش مرے تعاقب میں
سفر سفر یہ بچھل پائی ساتھ جائے گی　　(ریاض مجید)

میرے مردہ جسم سے کچھ اور پتھر باندھ دے
موج ابھارے بھی اگر تو مت ابھرنے دے مجھے　　(ریاض مجید)

عمر گذرے گی امتحان میں کیا
داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا　　(جون ایلیا)

تمہارا ہزاروں سے رشتہ لگا
کہو سائیں کا کام کیسا لگا　　(عادل منصوری)

جس پیڑ کی ہم نے کی ہے سیوا
کھایا کسی اور نے ہی ہے میوا　　(ظفر اقبال)

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا　　(بشیر بدر)

ہم روح سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ　　(رضی اختر شوق)

کہتی ہے ڈائری کہ ابھی کل ملے تھے ہم
محسوس ہو رہا ہے ہزاروں جنم ہوئے　　(مظفر حنفی)

جانے وقت کا صدی بالک شور مچا کر کب سو جائے
آرے غم محبوب میں تجھ سے پچھلے جنم کی بات کروں　　(مظہر امام)

آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ مخصوص مواقع پر زرتار ساریاں یا سادہ دو شالوں کا استعمال ہمارے معاشرے میں عام ہے ہمارے گاؤں میں آنے والوں کے استقبال میں چوکھٹ پر دئیے جلا کر رکھنے کی خوبصورت رسم آج بھی رائج ہے ہندوؤں میں بطور احترام بزرگوں کے پیر چھونا بھی روزمرہ کی بات ہے۔ اسی طرح ہمارے بھانت بھانت کے عقیدوں، رسموں اور توہمات کے نقوش نئی غزل میں بالافراط ملتے ہیں۔ کسی شعر میں رات کے وقت دریا کے ساکت پانی میں چراغ بہائے جاتے ہیں تو کہیں خواب کا صدقہ اتارا جاتا ہے۔ کسی شعر میں چھوت چھات پالنے والے یا بہن بیٹی کی سسرال میں پانی نہ پینے والے خاک میں ملتے نظر آتے ہیں تو کہیں سوئے کی سات کیلیں گاڑ کر ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے ہیں۔ کہیں یادوں کے مرقد پر پھولوں کی چادر چڑھائی جاتی ہے تو کسی شعر میں چتا پر مردے نذر آتش ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور پھر اس کی راکھ سے ہڈیوں کے پھول چننے کی رسم بھی نئی غزل کا شعر ہی ادا کرتا ہے۔ کہیں دل جلی رات اشکوں کے نئے پھول سے مانگ سجاتی ہے تو کسی جگہ منہ دیکھ دیکھ کر ٹیکے لگانے پر طنز کیا جاتا ہے، کسی شعر میں دل کے کھلے دروازے پر کوئی پرچھائیں چپکے سے دیا رکھ جاتی ہے تو کہیں دئیے منڈیروں پر ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔ کسی شاعر کو شادی کے موقع پر اعزو اقرباء میں ہلدی کھیلنے کی رسم یاد آتی ہے اور وہ اپنی شعری دنیا کو بھی ہلدی اور کیسر سے زرد کر لیتا ہے۔ کہیں تنہائی میں نئے رنگ سجا کر رنگولی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، کہیں سوکھے پھول دریا میں بہائے جاتے ہیں اور اس طرح ہندو عقیدے کے مطابق مردے کی آخری رسم پوری کی جاتی ہے، کہیں بزرگوں کے مزاروں پر پڑے ہوئے سوکھے پھول خوش عقیدگی کے تحت بطور تبرک اٹھا لیے جاتے ہیں۔ کوئی نیا شاعر سادھوؤں کے رخ کی زردی، ان کے کاسۂ گدائی اور جسم پر ملی ہوئی بھبھوت سے اپنی غزل کا مواد حاصل کرتا ہے تو کسی شعر میں بدروحوں کے سائے لرزتے ہیں ہندوستان میں توہم پرستوں کی کمی نہیں ہے لہٰذا چھل پائیاں غزل کے شعروں میں بھی گھس آئی ہیں مردوں کو دریا میں بہانے کا ذکر بھی نئے شعرا نے کیا ہے۔ خالص ہندوستانی طرزِ فکر مثلاً مصائب سے نجات پانے کے لئے دان دینا، سائیں لوگوں کی خدمت، درختوں کی سیوا کر کے میوہ

حاصل کرنے کے گُر اردو شاعری کو نئے شاعروں کی دین ہیں تناسخ کا عقیدہ جو ویدوں کے بطن سے ابھرا ہے۔ نئے شاعروں کے ہاں رخ بدل بدل کر اپنے روپ دکھاتا ہے اور نئی غزل میں مختلف جسم لے کر تکمیل ذات کی باتیں بہت کی گئی ہیں۔

ویدوں کا ذکر نکلا ہے تو اس پہلو کی جانب بھی اشارہ کرنا چاہوں گا۔ نئے شعرا نے مختلف دیوی اور دیوتاؤں کا ذکر غزلوں میں کھل کر کیا ہے۔ ثبوت میں مندرجہ ذیل اشعار پیش ہیں

سیمنٹ کی سلوں میں وہ جنگل کی رادھیکا
جھومر جبیں پہ، کان میں بالا پڑا ہوا (منصور سرواری)

میرے بچے ہیں بہت شوخ کنھیا کی طرح
اور گھر میں مری بیوی کسی رانی جیسی (رزاق عادل)

ہزاروں بھیس میں پھرتے ہیں رام اور رحیم
کوئی ضروری نہیں ہے بھلا بھلا ہی لگے (بشیر بدر)

مجھ کو خود ہی اپنے دس احکام نہیں معلوم
میرے اندر راون ہے یا رام نہیں معلوم (مظفر حنفی)

تمام زور مرا آئینے نے چھین لیا
کہاں سے رام نے بالی پہ تیر مارا ہے (مظفر حنفی)

کتنی اونچی پربت ہے تیری جنتا کے رکھوالے
شکتی کا پرچار کرے گی تیری پریم دوانی (فرزانہ عزیز)

یہ جنتا یہ ہم لوگ کالی کی بھیڑوں کا گلہ کہاں بھینٹ چڑھنے کو جائیے
تمہیں قتل کردو تمہارے علاوہ کوئی مہرباں بھی ہمارا نہیں ہے
(شاد عارفی)

بنے گھروندے لاٹ اور کھمبے ہیں خاشاک سماں
بھیروں ناچ رہی ہے پہنے ناگ کا ہار ہوا (ادیب سہیل)

آسمانوں پہ لچکتی ہوئی یہ قوس قزح
بھیس بدلے ہوئے راون کی کماں ہے یارو (اقبال ماہر)

ہاں اس میں کام دیو کی کوئی نہیں خطا
رشتے وفا کے سخت تھے دلبر بدل گئے (فضیل جعفری)

نکلے مکاں سے تو دن اس حال میں ملا
سر پر تھا بوڑھے درد کے سورج کا دیوتا (یوسف جمال)

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے (اشہر بدر)

چڑھتے سورج کے پجاری وہی نکلے جو شہاب
کرتے تھے تذکرۂ صدق و صفا ہم سے بہت (شہاب جعفری)

کوئی مرل ہو مگر ساتھ رہی
زندگی ہے کہ ستی ساوتری (فصیل جعفری)

اے زمیں ہم خاک زادوں سے جدا ہے کس لیے
ہم ترے بچے ہیں تو ہم سے خفا ہے کس لیے (ریاض مجید)

شہد کے دھوکے میں لپٹیں پی رہے تھے آدمی
آگ میں دھرتی کی ششدر دیوتا پانی کا تھا (نشتر خانقاہی)

ہر مورتی میں شاید بھگوان رو رہا ہے
ہر وقت مندروں میں اک چیخ گونجتی ہے (کیف احمد صدیقی)

اوپر نیچے آگے پیچھے دائیں بائیں روک
چنتا کی لچھمن ریکھاؤ آگے جانے دو (مظفر حنفی)

بوف لگی رادھاؤں میں
تانڈو لیلا کچھ تو کر (مظفر حنفی)

ابھیمنیو اس بھیڑ سے لیکن باہر کیسے نکلے گا
شبدوں کے اس چکر ویوہ میں الجھا ہر اک قاری ہے (نصیر پرواز)

آپ نے دیکھا نئی غزل کے اشعار میں رادھیکا بھی ہے اور شوخ کنھیا بھی براجمان ہیں۔ یہاں رام بھی ہیں اور راون بھی۔ کہیں رام بالی پر اس طرح چھپ کر تیر چلاتے ہیں کہ سامنا پڑنے پر ان کی آدھی شکتی بالی کو منتقل نہ ہونے پائے۔ شکتی کی دیوی کالی پر بھیڑوں کی قربانی دی جاتی ہے کہیں شیوجی سانپوں کا ہار پہنے موت کا ناچ دکھاتے ہیں تو کہیں راون کی کمان کا ذکر۔ کام دیو بھی موجود ہیں۔ مندروں میں گیلے گیلے بالوں کو کھولے ہوئے دیویاں اپنے سورج دیوتا کا انتظار کرتی ہیں تو پانڈوؤں کی ماں کنتی اور ان کے سوریہ دیو سے تعلق کی داستان ذہن میں

تی ہے ۔ ستیہ واں کو یم دوت کے ظالم ہاتھوں سے چھین لینے والی ستی ساوتری کا رجہ بھی دیوی جیسا ہے ۔ دھرتی ماتا کے ذکر سے تو بن عرل اس طرح لبریز ہے یسے نوزائیدہ بچے کے جسم میں ماں کا دودھ. خون بن کر رواں ہوتا ہے ۔ پہلے گر راکشش آگ اور انگارے کھاتے تھے تو آج کا انسان شہد کے دھوکے میں آگ کی پٹیں پیتا نظر آتا ہے اور پانی کے دیوتا اس کی حرکتوں پر ششدر دکھائی پڑتے ہیں ۔ مورتیوں میں بھگوان گریہ و زاری کرتے ہیں تو سیتا کو محفوظ رکھنے کے لئے چھمن کا کھینچا ہوا دائرہ چنتا کی لچھمن ریکھا بن کر بن عرل میں داخل ہوجاتا ہے ۔ حدیے سے عاری لڑکیوں کو برف لگی رادھا کہہ کر شیوجی سے تانڈو ناچ کی درخواست بھی نئے شاعر کی زبان پر آجاتی ہے اور شبدوں کے چکرویوہ دیوہ میں ہیں الجھا ہوا ابھیمنیو بھی عرل میں جلوہ گر نظر آتا ہے ۔ اب کچھ ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں رامائن ، مہابھارت اور میگھ دوت وغیرہ کے کردار راحمان ہیں

جس طرف دیکھئے صحرا نظر آتا ہے مجھے
ان گنت صدیوں کا بن باس ڈراتا ہے مجھے		(سلطان اختر)

ٹوٹی ٹوٹی سی ہر اک آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے		(جاں نثار اختر)

اشیاء کی لذتوں میں اٹکتا ہوا بدن
اور روح کا کھنچاؤ ہے بن باس کی طرف		(عادل منصوری)

گھر ملا ہے جسم کے جنگل میں چودہ سال بعد
جس میں دو مٹھی ہوا ہے ہاتھ بھر کا آسماں		(مظفر حنفی)

عشق ہے مرکے سونمبر میں اسے جیتا ہے
دل سری رام ہے دلبر کی ادا سیتا ہے		(سید افضل جعفری)

ابھی گھنشیام ہے اس دشت کا بوٹا بوٹا
برگ ہے آج کے انسان کے لیے گیتا ہے		(سید افضل جعفری)

مجھے بھی اپنی شکستوں کا یوں صلہ مل جائے
ہرن کو ڈھونڈنے نکلو شکنتلا مل جائے		(مجیب رامش)

کالے دیو کی کالی نگری اپنی موت کی حامل تھی
رام کا لشکر دیکھ کے ہم کو راون کا سر یاد آیا		(اندر سروپ نادان)

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ رام چندر جی کے بن باس کا واقعہ نئے شاعر کے لیے سب سے زیادہ کشش کا باعث بنتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہماری موجود دشواریاں نئے زمانے کی جکڑ بندیاں اور جذباتی میلانات اس واقعۂ خاص سے بڑی مطابقت رکھتے ہیں چنانچہ اس کو تلمیح ، تشبیہ یا علامت کے روپ میں استعمال کرنا ایک عام سی بات ہے ۔ اس ضمن میں جاں نثار اختر جیسے کہنہ مشق فنکار ، عادل منصوری جیسے تجریدی شاعر اور سلطان اختر جیسے رچاکر بیا شعر کہنے والے سبھی شانہ بشانہ نظر آتے ہیں ۔ کسی کے ہاں انسانی ارتقاء کی ان گنت صدیاں بن باس بن جاتی ہیں اور زندگی ایک صحرا کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ کسی کے تمام آسرے ٹوٹ جاتے ہیں اور اس کا جیون رام کے بن باس کی تصویر بن جاتا ہے ۔ کسی کو بن باس کے عالم میں ہر سمت گونج سی محسوس ہوتی ہے ۔ جس سے جنگل کے سائیں سائیں کرنے کا تصور جاگتا ہے ۔ یہ آواز ماریچ کی بھی ہوسکتی ہے جو مرتے ہوئے رام کو پکار کر لچھمن اور سیتا کو تشویش میں مبتلا کردیتا ہے ۔ کہیں بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل سے دو چار معاشرے میں مسلسل چودہ سال کی بن باسی کیفیت سے گزرنے کے بعد جو مکاں ہاتھ آتا ہے وہ اتنا تنگ ہے کہ اس میں ہوا کا گذر بہت کم ہوتا ہے اور اس کی بالکنی ایسی کوتاہ ہے کہ وہاں سے آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا ہی دیکھا جاسکتا ہے ۔ نئی غزل کے اس رنگ محل میں راجہ جنک کا سوئمبر بھی ہوتا ہے جس میں رام اپنی سیتا کو حاصل کرتے ہیں تو کہیں جنگل میں گھنشیام بنسری بجاتے دکھائی دیتے ہیں اور گیتا کا ذکر بھی بر سبیل تذکرہ آجاتا ہے ۔ عظیم شاعر کالیداس کے کردار دشینت اور شکنتلا بھی نئے شاعر کے فکری کینوس پر جلوہ گر ہوتے ہیں اور اردو شاعری میں مشترکہ تہذیب کے نقوش کی تکمیل کرتے ہیں :

اسی طرح ویدک طریقۂ عبادت اور اس سے متعلق تلازمے بھی کہیں براہ راست اور کہیں تشبیہوں ، تلمیحوں اور علامتوں کی حیثیت سے نئی غزل میں رونما ہوتے ہیں :

کب جھلستے ہوئے صحرا میں سمندر نکلے
میں جسے پوجنا چاہوں وہی پتھر نکلے (رشید افروز)

مسجد کی اذاں ہو کہ شوالے کا گجر ہو
کس میں مرے جذبات کا اظہار نہیں ہے (مدحت الاختر)

دوارے دوارے الکھ جگانے کو تو ساری عمر پڑی ہے
سیج سجی دو چار گھڑی کو کر لے رین بسیرا جوگی　(بمل کرشن اشک)

صبح بستر سے اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
دھوپ کی آہٹ پہ چونک اٹھے ہیں مندر کے کلس　(بشیر بدر)

وہ تو پہلے ہی سے پتھر ہے سمجھ لو سن لو
یوں تو جاتے ہو وہاں پھول چڑھانے ہو اسے　(عبدالرحیم نشتر)

فرار اب تو فقط راستے کا پتھر ہوں
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیوداسی کا　(احمد فرار)

شاعری میری تپسیا لفظ ہے نرگد مرا
یہ رمیں، پیاری رمیں، مشفق رمیں معبد مرا　(نثار ناسک)

کون سا نروان یاں حاصل تجھے ہوگا ریاض
سارا سارا دن یہ یونہی ریستورانوں میں بیٹھ　(ریاض مجید)

کون میرا پوچھنے والا ہے جو آگے بڑھے
میں اکیلا دیوتا جلتے ہوئے مندر میں ہوں　(ریاض مجید)

چاہتے ہیں جو مظفر غم ہستی سے فرار
بیٹھ جائیں وہ گڑھا کھود کے سادھو کی طرح　(مظفر وارثی)

ترے دیوانے ہر رنگ رہے ترے دھیان کی جوت جگائے ہوئے
کبھی نتھرے ستھرے کپڑوں میں کبھی رنگ بھبھوت رمائے ہوئے
(احمد مشتاق)

سنگ میل نظر پڑتا ہے وہ سادھو جو دھیان لگائے
من مندر کی جوت جگا کر آنکھیں بند کئے بیٹھا ہو　(شاد عارفی)

یہ دھیان جس میں چھب کی سدا مورت بنتی ہے
وہ عالم ہو ہوگا خیال کو ترسوگے　(طاہر فتح پوری)

پریم پجاری مندر مندر دل کی کتھا کیوں گاتے ہو
مت سارے پتھر ہیں پیارے پتھر سے سر مارو گے　(سجاد باقر رضوی)

ڈالو مرے کانوں میں بھی پگھلا ہوا سیسہ
اے برہمنوں میں نے بھی تو وید سنا ہے　(سلیم بیتاب)

ایسے ہم دیکھتے ہیں دل کے اجڑنے کا سماں
جس طرح داسیاں جلتا ہوا مندر دیکھیں (سلیم بیتاب)

غسل خون کی آرزو میدان میں لائی اسے
جھاڑیوں میں جو ہیولیٰ صدیوں سے روپوش تھا (عقیل حامد)

وقت سے پہلے ہی موسم کو رنگ بدلتے دیکھا تھا
خوش فہمی اُجلی سانسوں کا سنکھ بجا کر لیٹ گئی (سلطان اختر)

صدائے ناقوس بتکدہ پر گرفت کا مشورہ نہ دیجیے
عبادت و بندگی کے مانع نہیں ہے جب برہمن ہمارا (شاد عارفی)

مندرجہ بالا شعروں میں پتھر کے دیوتاؤں کی پوجا ہوتی ہے مسجد کی اذان کے ساتھ شوالوں میں گجر بجتے سنائی دیتے ہیں۔ جوگی کہیں دیں بسیرا کرنے کے بجائے دوارے دوارے الکھ جگاتے ہیں تو کہیں دھوپ کے مندروں کے سنہری کلس جگمگا اٹھتے ہیں۔ کہیں پتھروں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں تو کہیں دیوداسی اپنے محبوب دیوتاؤں کے چرن دھوتی ہیں، کہیں لفظ کے برگد کے نیچے شاعری کی تپسیا کرکے گوتم بدھ کی پیروی کی جاتی ہے اور انہیں کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر نروان حاصل کرنے کی باتیں کی جاتی ہیں، کہیں جلتے ہوئے مندر میں اکیلا دیوتا اپنے پجاریوں کو آوازیں دیتا ہے اور کسی شعر میں حبس دم کے ماہر سادھو گڑھا کھود کر زندہ دفن ہونے کی تیاری میں مصروف نظر آتے ہیں، کہیں یہ سادھو بدن پر بھبھوت رمائے گیان دھیان میں اسطرح مگن ہیں کہ سنگ میل کی طرح ساکت و جامد نظر آتے ہیں، کہیں دھیان میں چھب کی سدا برت تقسیم ہوتی ہے تو کسی جگہ پریم پجاری مندروں میں دل کی کتھا سناتے دکھائی دیتے ہیں کسی کے ہاں برہمن ویدوں کا پاٹ کرتے دکھائی دیتے ہیں تو کسی شعر میں مندروں کی داسیاں اداس بیٹھی ملتی ہیں، کہیں دیوتاؤں کے روبرو قربانی دیکر انہیں خون سے غسل دیا جاتا ہے، کسی جگہ سنکھ پھونکے جارہے ہیں اور پھر صدائے ناقوس بتکدہ پر گرفت کے مشورے کو اس لیے رد کیا جاتا ہے کہ برہمن ہماری بندگی کے مانع نہیں ہیں نئی غزل کے یہ تمام اشعار اردو شاعری کی اس کشادہ قلبی اور وسیع المشربی کی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں جو ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کی مظہر ہے۔

نئی غزل نے ہندوستان کی تاریخ سے بھی اپنے لیے تشبیہیں ، تلمیحیں اور مواد اخذ کیا ہے اور ہندوستانی سماج کے تصورات و رجحانات کی عکاسی کا فریضہ انجام دیا ہے مثلاً ۔

مورتوں کے پاؤں کے نیچے خزانے تھے چھپے
میں نے حسن مندر کو چھوڑا اس پہ پہرے ہوگئے (ماجد الباقری)

تجھ سے امٹ سمجھوگتا
تو پران میں تو سانس میں (منصور سبزواری)

پتھر پر کندہ شبدوں کو دیمک چاٹ گئی
کاغذ پر لکھے حرفوں کا کچھ تو حال سناؤ (وہاب دانش)

گو کہ قرطاس و قلم سے رہے محروم مگر
لکھ گئے لوگ چٹانوں پہ کتھائیں کیا کیا (قمر اقبال)

کاش کہیں سے مجھ کو دبی یکسوئی مل جائے
وعدوں کے استوپ بنا کر توڑ دیا کرتا ہوں (صادق)

پڑا ہوں غار میں پتھر کے ایک بت کی طرح
جمی ہوئی ہے مرے تن بدن پہ صدیوں کی دھول (زیب غوری)

کیا خواہشیں زمین کے نیچے دبی رہیں
غاروں سے کچھ مجسمے نکلے وصال کے (زیب غوری)

وہی بدن وہی چہرہ وہی لباس مگر
کوئی کہاں سے بساون کا موقلم لائے (امین راحت چغتائی)

مندروں میں مورتیوں کے پیروں تلے دفینوں کو پوشیدہ کرنا ، سمجوگتا کا اپنے پریتم (پرتھوی راج) کے لیے سراپا سپردگی بن جانا ، پتھر کی لاٹوں پر لکھے ہوئے اشوک اور دوسرے حکمرانوں کی فرامین ، اجنتا ، الورا اور الفنٹا وغیرہ میں مصوری اور مجسمہ سازی کے ذریعہ چٹانوں پر قدیم تہذیب کے مظاہرہ کی داستانوں کو اگلی نسلوں کے لیے محفوظ کردینا ، استوپوں کی تعمیر ، غاروں سے صدیوں پرانے مجسموں کی بازیابی اور دربار اکبری کے مایۂ ناز مصور بساون کی توصیف وغیرہ سے مزین ان اشعار میں تاریخ ہند سے متعلق جو باتیں کی گئی ہیں وہ اپنے ہندوستانی مزاج کی از خود غمازی کرتی ہیں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے " مراثی انیس میں ہندوستانیت " کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے :

" یہ واقعہ ہے کہ زبان کا استعمال اپنے ساتھ ایک مخصوص ذہنی فضا، ایک مخصوص ملکی مزاج اور ایک مخصوص سماجی رنگ لیکر آتا ہے اور جس شاعر کی لفظیات اور اس کے استعمال کا دائرہ جتنا بڑا ہوگا اسی نسبت سے زبان کا اپنا مخصوص سماجی رنگ اس کی شاعری میں زیادہ سے زیادہ جھلکے گا۔

(ماہنامہ "آج کل" دہلی بابت جون ۷۵ع، میر انیس نمبر۔ ص ۲۹)

اس خیال کی تائید میں پوری اردو شاعری بالخصوص نئی غزل پیش کی جاسکتی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے اردو زبان بھی وجود میں آئی اور ایک مشترکہ تہذیب بھی، چنانچہ ایک ہی سرچشمے سے فیضیاب ہونے والے یہ عناصر ایک دوسرے کو بھی متاثر کرتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں کافی مثالیں اور شہادتیں پیش کی جاچکی ہیں، ایک زاویے کی طرف اور متوجہ کرنا چاہتا ہوں اسلام کی وحدانیت اور اس کا مخصوص مزاج کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس میں صنمیات، اساطیر اور دیو مالا کے فروغ کی گنجائش نہیں لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اسلامی شریعت کے پہلو بہ پہلو صوفیائے کرام کی لچکدار وسیع المشربی ہندوستانی آب و ہوا کی جاذبیت اور دیگر اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے میل جول نے جو اجتماعی لاشعور تخلیق کیا اس میں ہندوستانی دیو مالا کے بے شمار مظاہر مرتسم ہوگئے اور تخلیق کاروں کے اذہان ان دیو مالائی اثرات کو لا شعوری طور پر اپنے فن پاروں میں منعکس کرنے لگے۔ نئی غزل تک آتے آتے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب شعرا کے ہاں یہ عمل قدرے شعوری بھی ہوگیا ہے، جس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ نیا شاعر اب غزل میں عجمی لے کو قدرے مدھم کر کے مقامی سروں کے ذریعہ اپنی دھرتی اور اپنے عوام کے نزدیک تر آنا چاہتا ہے۔ ذرا یہ اشعار دیکھئیے:

کن کن کی آتمائیں پہاڑوں میں قید ہیں
آواز دو تو بجتے ہیں پتھر کے دف یہاں (جاوید)

تو کنول کی شکل میں پھوٹے گا اپنی ذات سے
جسم کی خواہش کے گہرے پانیوں میں بھی اتر (نثار ناسک)

پرچھائیاں پوجیں گے کہاں تک یہ پجاری
اپناؤ کوئی جسم کوئی روپ تو دھارو
(رشید قیصرانی)

یہ سب سمجھ رہے ہیں کہ پروان مل گیا
چکرا رہی ہے چیل مگر ماس کی طرف
(عادل منصوری)

مبارک ہے مثل ماہ مگر سرمئی بدن
اے جان تجھے یہ کس نے دیئے غسل آگ کے
(شمس الرحمن فاروقی)

تمام رات مرے غم کا زہر چوستا ہے
اسی لیے تری یادوں کے ہونٹ نیلے ہیں
(سلطان اختر)

اس بن میں کیا کرتی ہے تپ میری انا بھی
اس شہر میں ہے کارگہہ ارض و سما بھی
(عمیق حنفی)

عہد رفتہ کے پر اسرار گھنے جنگل میں
پھونک کر سحر بنا دیتی ہیں پتھر یادیں
(وحید اختر)

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئیے
پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی
(حامد محمود)

جڑ مل گئی مجھ کو پاتال کی
بتاؤ تو اب کیا رہا خاک میں
(غلام مرتضیٰ راہی)

زہر کا ساگر مگر وجود
سیکھیں امرت منتھن لوگ
(حنیف کیفی)

اس کی پیشانی پر سورج ہاتھوں میں ترشول
میرے تن پر بیل چڑھی ہے سینے میں سیماب
(مظہر حنفی)

اٹھے بنا کے شعلوں میں اپنے تو یہ کھلا
دونوں جہاں میں پھیلی ہوئی تیری باس تھی
(وزیر آغا)

حائل راہ تھے کتنے ہی ہوا کے پربت
تو وہ بادل جو مرے شہر سے گذرا ہی نہیں
(شکیب جلالی)

بہت اکڑتا تھا وہ اپنے جسم کے بل پر
برت کے دیکھا تو ٹوٹی ہوئی کمان لگا
(شاہد کبیر)

جانے یہ کونسی نیکی مرے کام آئی ہے
ورنہ یہ شعلۂ عصیاں تھا جھلسنے والا
(ساقی فاروقی)

اداسی کے گھنے برگد کے نیچے
کسے آواز دیں کس کو بلائیں (پرکاش فکری)

بھیک پانے کے لیے بھیس تو بدلا ہوتا
تیرے ملبوس کی خوشبو ہے تونگر جیسی (پرکاش فکری)

جب سے ہوا ہے راج پشاچوں کا شہر میں
جنگل میں ہم کو خوف نہیں اپنی جان کا (صادق)

بھائیو ہوچکا سوتے میں ہمارا نیلام
طفل نادان ہیں ہمیں اتنا پتہ ہی کیا ہے (ریاض مجید)

تیسری آنکھ سے اس پار کی ہر شے دیکھیں
پھر لہو رنگ وہ رخسار کہاں سے آئے (برق گیاوی)

اے زمین پھٹ جا کہ اب جینے کی خواہش مٹ گئی
اب وجود اپنا نظر آنے لگا بےکار سا (ریاض مجید)

پتھر میں ڈھلتا جاتا ہے میرا بدن تمام
یہ واقعہ ہے یا کوئی منظر ہے خواب کا (رہبر غوری)

لاکھ پاتال میں چھپ جاؤ فضیل
جسم کی چیخ سنائی دے گی (فضیل جعفری)

یہ کون رقص میں ہے یہ منظر کہاں چلے
دریا چلے ، پہاڑ چلے ، آسمان چلے (ساقی فاروقی)

آؤ ہوا کے ہاتھ کی تلوار چوم لیں
اب بزدلوں کی فوج سے لڑنا فضول ہے (شہریار)

بچھڑا ہر ایک شخص مرے خاندان کا
یہ مجھ کو شاپ لگ گیا کس بے زبان کا (صادق)

جس کو دیکھے اس کی آدھی شکتی تیری ہے
اتنا بھی کیا اے نارک اندام نہیں معلوم (مظفر حنفی)

سب اپنے غم کے نگہدار ہیں یہاں سے چلو
یہ چپ رہیں گے جو شعلوں پہ ہاتھ بھی رکھ دو (فضا ابن فیضی)

ہمارے حال پہ آنسو بھی رو رہے ہوں گے
کہ ہم تو جلتی چٹانوں کے میگھ دوت سے (منصور سبزواری)

یہ کس کی یاد کی پروہول سنسناہٹ ہے
کہ جیسے چیر کے دھرتی کو شیش ناگ اٹھا (مصور سبزواری)

آ دیکھ ان اچھوت گڈریوں کے دیس میں
ندی پہ ایک بانسری والا پڑا ہوا (مصور سبزواری)

یہ آتماؤں کا پہاڑوں میں قید ہونا اور آواز دینے پر پتھروں کا دف کی طرح بجنا اپنے اندر جو دیو مالائی کیفیت رکھتا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ہندو دیومالا کے مطابق وشنو سمندر میں شیش ناگ کی سند پر براجمان ہیں اور ان کی ناف سے کنول کا پھول نمودار ہوتا ہے جس کے بطن سے اس کائنات کو تخلیق کرنے والے برہما جنم لیتے ہیں ۔ نیا شاعر بھی خواہش کے گہرے پانی میں اتر کر اپنی ذات سے کنول کی طرح پھوٹنے کی بات کرتا ہے ۔ مہابھارت کی گھمسان لڑائی مدتوں چلتی ہے اور بے شمار سورماؤں کے گرو درونا چاریہ اپنے شاگرد ارجن کے فراہم کردہ تیروں کے بستر پر میدان جنگ میں نیم جانی کی کیفیت میں دراز رہ کر انجام کا انتظار کرتے ہیں تو یہ واقعہ بھی نئی غزل کو اس طرح متاثر کرتا ہے کہ اس کا ایک کردار حریفوں کے درمیان نیم جان پڑا رہ جاتا ہے اور اس کے جاں نثار اس پر فدا ہوجاتے ہیں ۔ کہیں نئی غزل کے آئینے میں نرگن بھگوان کی پوجا کرتے کرتے پجاری تنگ آکر اپنے معبود سے کوئی جسم اختیار کر کے اوتار لینے کی التجا کرتا ہے تو کہیں گوتم بدھ کے نروان کو زیر بحث لایا جاتا ہے ، دیومالا میں آگ میں تپ کر پوتر ہونے یا اپنے تقدس کے ثبوت میں اگنی اشنان کرنے کی کئی مثالیں ہیں خود سیتاجی کو اس امتحان سے گزرنا پڑا تھا نئے شاعر نے بھی اپنی جان کو غسل آتشیں دیا ہے شیوجی نے دیوتاؤں کی خاطر سمندر سے برآمد ہونے والا سارا زہر خود پی لیا تھا جس کے زیر اثر ان کا کنٹھ نیلا پڑھ گیا تھا نئے شاعر کی یادوں کے ہونٹ اس لیے نیلے پڑجاتے ہیں کہ انھوں نے تمام رات عاشق کے غموں کا زہر چوسا ہے ۔ اگر عہد عتیق میں آریائی رشی منی جنگلوں میں تپسیا کیا کرتے تھے تو نئے غزل گو کی انا بھی بن میں تپ کرتی نظر آتی ہے اہلیا کو رشی کی بددعا نے پتھر کی سل بنا دیا تھا (جو رام چندرجی کے قدموں کو مس کرکے دوبارہ انسانی پیکر میں آگئی) نئی غزل کے پراسرار جنگل

میں یادوں کا سحر بھی کسی کو پتھر میں تبدیل کردیتا ہے ۔ اگر راون کو رام چندر کے دلاور تحت الثری میں جاکر اٹھکائے لگاتے ہیں تو نئی غزل بھی پاتال کی خبر لاتی ہے ۔ دیومالا میں دیوتا اور راکشش مل کر سمندر جلوتے ہیں اور اس میں سے زہر برآمد ہوتاہے تو نیا شاعر بھی اس زندگی کو زہر کا ساغر سمجھ کر منتھن کا فن سکھاتا ہے وشوامتر منی گیان دھیان میں اس طرح مگن ہوجاتے ہیں کہ ان کے بدن پر بیلیں چڑھ جاتی ہیں اور بالوں میں پرندے گھونسلے بنا لیتے ہیں نیا شاعر بھی سینے میں کھولتے ہوئے جذبات رکھنے کے باوجود اپنے گہرے انہماک کے ثبوت میں تن پر چڑھی ہوئی بیل دیکھاتا ہے اور شیو کی پیشانی کے نورانی ہالے اور ہاتھوں کے ترشول کے حوالے سے رقص فنا کی جانب اشارہ کرتا ہے ۔ نئی غزل میں دیومالا کے پرس رام کی طوفانی اکڑجوں رام چندر کے ہاتھوں کمان کی طرح ٹوٹ جاتی ہے ۔ کرشن جی کے بچپن کا وہ واقعہ جب وہ چاند لینے کے لیے مچل گئے تھے اور کسی گیانی نے ان کے ہاتھوں میں آئینہ پکڑا دیا تھا ۔ نئی غزل میں نئی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے مہابھارت کی طرح یہاں بھی آگی بان جلتے ہیں لیکن کوئی نیکی آڑے آتی ہے اور نیا شاعر جلنے سے بچ جاتا ہے گوتم بدھ کی یاد دلانے کے لیے یہاں بھی اداسی کے گھنے برگد کے نیچے کسی کو یادکیا جاتا ہے نئی غزل کہیں نل و من کے عشق کی داستاں سے استفادہ کرتے ہوئے محبوبہ کے دوارے بھیس بدل کر بھیک مانگی جاتی ہے تو کہیں شہر میں پشاچوں کا ایسا راج ہوجاتاہے کہ شعراء جنگل کو جائے امان سمجھنے لگتے ہیں کہیں بھائی بھائی کو سوتے میں یوں نیلام کردیتے ہیں جیسے کورو اپنے پانڈو بھائیوں سے دغا کرتے رہے تھے ۔ کہیں شیواجی کی اس تیسری آنکھ کا ذکر ہے جو ہر شے کو بھسم کردیتی ہے اور کسی شعر میں زمین اس طرح پھٹتی ہے جیسے سیتاجی کو پناہ دینے کے لئے پھٹ گئی تھی ۔ بکاولی کی طرح بدن کا پتھر میں ڈھل جانا قدیم ہندوستانی اساطیر میں مذکورہ بستی جس کے باشندوں کو جادوگروں نے نصف پتھر کا بنا دیا تھا ۔ شیواجی کے تانڈو رت کے زیر اثر دریا ، پہاڑ اور آسمان سب کا نیست نابود ہوجانا بھی کہیں تشبیہ کی صورت میں کہیں استعارہ بن کر اور کہیں تلمیح یا علامت کے روپ میں نئے شاعر کے کام آیا ہے ۔ نئی غزل میں آپ کو وہ کردار بھی نظر آئیگا جو

بزدلوں کی فوج سے لڑنا نہیں پسند کرتا اور اس طرح مہابھارت کے اس سورما کی یاددلاتا ہے جس نے شکھنڈی کو نامرد سمجھ کر تلوار نہیں اٹھائی تھی۔ یہاں شراب کے زیر اثر خاندان کے افراد بچھڑ جاتے ہیں اور ستیہ وادی راجہ ہریش چندر کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور محبوب کو مالی کی اس صفت کے متصف کیا جاتا ہے کہ جس پر اس کی نگاہ پڑھ جاتی تھی اس کی آدھی طاقت مالی کے جسم میں منتقل ہوجاتی تھی۔ ان شعروں میں لوگ شعلوں پر ہاتھ رکھ کر دیومالا کے کرداروں کی طرح اپنی صداقت کا ثبوت دیتے بھی نظر آئیں گے اور کالی داس کے میگھ دوت کی طرح تپتی ہوئی چٹانوں پر آنسو بھی بہاتے ہیں نو غزل میں شیش ناگ کا ذکر بھی ہے اور ناگ کے پھن پر ایستادہ ہوکر بانسری بجانے والے کرشن کنہیا کا بھی چنانچہ الہامی صداقتوں اور دیو مالائی حکایتوں کی پر لطف آمیزش سے نئے شاعروں کی تخلیقات میں قوس قزح کے ساتوں رنگ بکھر گئے ہیں۔ مضمون خاصی طوالت اختیار کر گیا لیکن چار چھ شعر اور پڑھ لینے میں آپ کا کوئی ہرج بھی نہ ہوگا :

اب نہ وہ گیت نہ چوپال نہ پنگھٹ نہ الاؤ
کھو گئے شہر کے ہنگاموں میں حالات مرے (فضیل جعفری)

شیشے سا ڈھلا چوکا موتی سے چمکے برتن
کھلتا ہوا اک چہرہ ہنستے ہوئے سو درپن (ندا فاضلی)

چھن چھن کے آرہی ہو گپھاؤں سے روشنی
تن پر وہی لباس ہوں پیڑوں کی چھال کے (زیب غوری)

تیرا دیار ، رات ، مری بانسری کی لے
اس خواب دلنشیں کو مری کائنات کر (مجید امجد)

کوچے تو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے پربت ترے بستی تری صحـــرا ترا (ابن انشا)

دور تک مسکن تھے ان کے جا صداؤں کے منیر
دیر تک ان ساریوں کے غم شـــوالوں میں رہے (منیر نیازی)

حصار ظلمت شب سے نکل نجومے مت ڈھونڈھ
سلگ رہی سر راہ اک چتا اے دوست (امیر قزلباش)

آخری بار اس پہاڑی شانت مندر چل مرے ساتھ
اور بوجھل شام کی پہلی دعا محفوظ کرائے (باقی)

چھپر کی طرح اڑتے رہے آندھیوں میں ہم
گرتے ہوئے مکاں کی طرح ٹوٹتے رہے (حبیب کیفی)

کس جگہ رہیے کہاں دن کاٹیے کیا کیجئے
گاؤں میں کیچڑ بہت ہے شہر میں کم ہے ہوا (مظفر حنفی)

یہ چوپال، یہ گیت، یہ الاؤ، یہ پنگھٹ، یہ شیشے کی طرح چمکتا ہوا چوکا اور اس میں موتی کی طرح جیسے ہوئے برتن، یہ درپنوں کی طرح ہنستے ہوئے چہرے، یہ گپھاؤں میں چھن چھن کر پڑتی ہوئی روشنی اور یہ چھال کے لباس پہنے ہوئے قبائیلی، یہ رات کو بانسری کی لے کا بلند ہونا، یہ محبوب کے روٹھ کر عاشق کا جوگی بن جانا، یہ بتوں کو اپنا مسکن قرار دینے والے لوگ اور شوالوں میں ناریوں کا غم پالنے والے پجاری، یہ ظلمت شب میں سلگتی ہوئی چتائیں، یہ بوجھل شاموں میں پہاڑی پرشانت مندر، یہ آندھیوں میں اڑتے ہوئے چھپر، یہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے گاؤں جس مجموعی فضا کی تخلیق کرتی ہیں وہ خالص اور کھری ہندوستانی فضا ہے اور ایسے اشعار جن میں ایسی غیرمرئی ہندوستانیت رچی بسی ہے نئی غزل میں اتنی کثرت سے شامل ہے کہ ان کی نشاندہی کے لیے ہزاروں صفحات ناکافی ہوں گے انہیں خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے وزیر آغا نے کہا ہے

«یہ ماحول ایرانی چمن اور سطح مرتفع کا ماحول نہیں بلکہ جنگلوں شہروں، دیہاتوں اور کھیتوں کا ماحول ہے، ظاہر ہے اگر علامتیں اسی ماحول سے اخذ کی جائیں تو ان میں اپنی ذات کا اظہار نسبتاً آسانی سے کرسکے اردو غزل میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ شعرا کی ایک پوری جماعت نے اپنے احساسات کو اردگرد کی اشیاء، مظاہر اور علائم سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھا ہے جدید اردو غزل کے فروغ کا اصل باعث یہی ہے»

(اردو شاعری کا مزاج از وزیر آغا ص ٢٨٥)

● ● ●

جناب اسد اعجاز مدنی

مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری

مولانا آزاد کی سیاسی ڈائری دراصل یہ ایک عہد کی سیاسی تاریخ ہے۔ اس میں مشاہیر سیاست داں، ادیب اور شاعر، کانگریس کی تاریخ، حکومت برطانیہ کا کردار، مسلم لیگ کی سیاست، ہندو مہا سبھا کا رول، جنگ آزادی کی جد و جہد اور اس کا حصول، گاندھی جی کا قتل، ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز فسادات وغیرہ کا بیان ہے۔ اسمیں مولانا آزاد کے خاندان کا ذکر بھی ملتا ہے مولانا خیرالدین کی سیرت، کردار، عقائد، ان کی نجی زندگی اور ملکی و ادبی خدمات کا مذکور بھی ہے اس کتاب میں اس دور کی سیاسی کشمکش، قوم کی جد و جہد، جمود و تعطل، سود و زیاں، پیش اور رفت پسپائی کا بھی ذکر ہے۔

عقائد کے لحاظ سے ابن قیم اور ابن تیمیہ سے متاثر تھے وہ ظاہرداری کے سخت مخالف تھے ہر بات حدیث اور قرآن کی روشنی میں پیش کیا کرتے تھے۔

مولانا موصوف مذہب کی بنیاد پر سیاسی پارٹی ہرگز بنانا نہیں چاہتے تھے وہ دوقومی نظریے کے سخت مخالف تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست مبلغ تھے۔ کور مغزوں نے انہیں شو بوائے بے دین، کافر، خدا جانے کیسا کیا کہا مگر وہ اپنے ارادے اور خیال میں متزلزل نہ ہوئے اور ہر خیال سے گذر گئے

طعنی بہم رساں کہ بسازی بعالمی
با ہمتی کہ از سر عالم تواں گذشت

اس کتاب میں مولانا آزاد اور گاندھی جی کی بے داغ شخصیت ملتی ہے جن پر ہندو اور مسلمان دونوں نے ظلم و ستم کئے انھوں نے آزاد اور گاندھی کی نفسی شرافت ، ضمیر کی عظمت ، بے لوث طبیعت کی صدہا مثالیں دی ہیں اور ان کی شخصیت کے خد و خال کو پورے طور پر نمایاں کیا ہے

یہ کتاب دوسرے لفظوں میں ایک تہذیبی کارنامہ ہے

حقیقت میں اس کتاب کے مطالعے سے نوجوانوں میں ولولہ ہی نہیں بلکہ ملک و قوم کی خدمت کا خیال پیدا ہو گا

• • •

مولانا آزاد — ایک سیاسی ڈائری مرتبہ اثر بن یحییٰ انصاری
ناشر : عالیہ پبلیکیشنز ، دھولیہ - مہاراشٹر
قیمت : ساٹھ روپیے

• •

نوائے ادب

کے

مقالہ نما

میں مضامین و مقالات کے اندراج کے لیے
رسالے اور جریدے

اور

کتابی دنیا

میں تبصرے کی غرض سے
کتابوں کے دو نسخے
ارسال کیے جائیں (مدیر)

ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر

حیات بیدل

ڈاکٹر امانت شیخ نورور جی واڈیا کالج (پونہ) کے شعبۂ اردو و فارسی کے سربراہ اور پونہ یونیورسٹی کے اردو و فارسی کے صدر ہیں۔ آپ ایک اچھے استاد ہیں۔ آپ کے مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ آپ کا مطالعہ وسیع ہے اور تنقید و تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

زیر نظر کتاب «حیات بیدل» آپ کے تحقیقی مقالہ کا ایک باب ہے۔ اس میں پانچ دیگر مضامین ہیں جو آپ کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ ہندی اور سنسکرت میں کوے کی اہمیت۔ بنگلہ زبان کا شاعر ٹیگور۔ پنجابی زبان کا ماہیا اور اردو زبان میں شعری تجربے یہ وہ مقالے ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ امانت صاحب زبان اردو کے علاوہ دوسری زبان کے ادبیات سے نابلد نہیں ہیں بلکہ ان سے استفادہ کرتے ہیں اور اس طرح زبان اردو میں پیش کر کے اس کی تنگ دامانی کو ختم کر دیتے ہیں اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیتے ہیں

ڈاکٹر صاحب نے حیات بیدل میں مرزا عبدالقادر بیدل کی زندگی اور ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقالہ در حقیقت مختلف تذکروں اور تنقیدی مضامین کا نچوڑ ہے۔ اس کی ترتیب سے ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی نظر اور تحقیقی شعور کا پتہ چلتا ہے

اس کتاب کی اشاعت مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کی رہین منت ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب لائبریریوں کی زینت بنے گی اور دانش مندحضرات اس کا ضرور خیر مقدم کریں گے۔

• • •

حیات بیدل مفقہ ڈاکٹر امانت شیخ
ناشر اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد
قیمت بارہ روپیے

ادبیات

اور سدید

۱۹۸۱ کی تنقید

۱۹۸۱ کی تنقید میں یہ بات بالخصوص متاثر کرتی ہے کہ نقاد نے اپنی توجہ زندگی کے «کل» پر مرکوز کی اور ادب کے حوالے سے زندگی کی متعدد جہتوں کو روشنی عطا کرنے کی کاوش کی۔ چنانچہ اب نقاد ایک مفکر کے روپ میں سامنے آرہا ہے۔ اس نے زندگی کے مختلف نظریات کو جدید ادبی تنقید کی روشنی میں پرکھنے کی کاوش کی ہے۔

عبدالوہاب قمر بستوی

[وشوا بھارتی یونیورسٹی کے فارسی
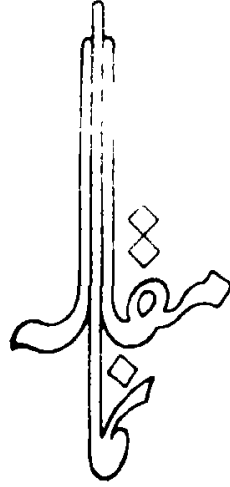
عربی اور اردو مخطوطات

ماہنامہ برہان، دھلی، دسمبر ۱۹۸۲ع
جلد ۸۹، شمارہ ۲، ص ۵۵ - ۶۴
جنوری ۱۹۸۲، جلد ۸۹، شمارہ ۷،
صفحہ ۵۳۸ - ۶۱]

اقساط ہذا میں مندرجہ ذیل مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

(۱) لطائف الطوائف : مصنف علی صفی
(۲) معدن الجواھر : مصنف مولوی طرزی
(۳) مجموعہ جامی : کمال کریم ناگوری
(۴) رقعات · مصنف امان اللہ حسینی
(۵) تحفۃ السلطانیہ : حسن بن گل محمد
(۶) بدائع الانشاء · یوسف بن محمد
(۷) دستور شگرف · عبدالواسع ہانسوی

معنی تبسم

حسرت کی غزل گوئی کے چند پہلو

(ماہنامہ سب رس حیدر آباد دکن نومبر ۱۹۸۲ . جلد ۴۳ شمارہ ۱۱ - ۱۲ صفحات ۱۵ - ۲۰

شاعری حسرت کے لئے وسیلۂ اظہار اور لطف اندوزی کا ایک ذریعہ ہے قدیم روایات کی پابندی کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے اپنے تجربات اور تخیل کے امتزاج سے ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے

ایرکان ترکمن

اردو اور ترکی

[ماہنامہ جامعہ، نئی دھلی، ستمبر ۱۹۸۲ . جلد ۷۹ . صفحہ ۷ - ۱۱]

اردو اور ترکی کے باہمی لسانی تعلقات دخیل الفاظ . ان کی گم گشتگی اور بازیافت کا بیان ہے

نورالاسلام صدیقی

« نوادرالالفاظ » - ایک بے مثال لغت

ماہنامہ جامعہ نئی دھلی، نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ جلد ۷۹ شمارہ ۱۱ - ۱۲، ص ۴ - ۵۵

« نوادرالالفاظ » اردو کی ایک قدیم ترین لغت ہے جو در اصل غرائب اللغات کی ترقی یافتہ صورت ہے

اردو لغت نویسی کے سلسلے میں آرزو کی یہ تالیف بہت بڑی اہمیت کی مالک ہے . اس کا سال تصنیف ۱۱۵٦ ہجری ہے . آرزو کی یہ تصنیف عہد اورنگ زیب سے لے کر شاہ عالم ثانی کے زمانے تک کی زبان اردو پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے .

امیر حسن عابدی

دیوان صلائی

ماہنامہ اعظم گڈھ، نومبر ۱۹۸۲ جلد ۱۳۰، شمارہ ۵ . ص ۳۳۷ - ۳۴٦

صلائی ۹۵۵ ھ میں ساحل مسرعات میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تربیت اسفرائن میں ہوئی ۹۸۱ ھ میں وہ ہندستان آنے کے لئے بے چین ہوئے اور رخت سفر باندھا لیکن ان کو وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شیرانی کلکشن میں دیوان صلائی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو خراب حالت میں ہے

صلائی کا کلام متوسط درجہ کا ہوتا ہے اس نسخہ میں ان کی غزلیں بہت کم ہیں اس دیوان کے دقیق مطالعہ سے ہمارے ہندستان کی تاریخ کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑ سکتی ہے

حمید آفاق قریشی

معرکۂ مکین و سودا

ماہنامہ معارف۔ اعظم گڈھ، فروری ۱۹۸۳
جلد ۱۳۱، شمارہ ۲، ص ۱۱۵ - ۱۳۱

اودھ کے چوتھے نواب آصف الدولہ کی نوابی کے دور میں لکھنؤ میں مرزا فاخر مکین اور مرزا محمد رفیع سودا کی چشمک کا واقعہ کافی مشہور ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اس کا صحیح پس منظر بیان کرتے ہوئے اس کی تاریخ بھی متعین کر دی ہے۔

گوپی چند نارنگ

شاعر حریت و فطرت - جوش ملیح آبادی

دو ماہی «الفاظ» علیگڈھ، جولائی - اکتوبر ۱۹۸۲، جلد ۷، شمارہ ۴-۵ ص ۷ - ۱۸

مزاج اور لہجے کے اعتبار سے جوش کی انفرادیت۔ مسلمات قدیمہ سے ان کی بغاوت اور نئے لہجہ اور نئی تکنیک کا بیان ہے

خواجہ حمید یزدانی

اقبال اور ایرانی اُدبا

ایران کے علماء، فضلاء، شعراء، اُدباء اور دانشوروں نے علامہ اقبال کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا۔ جو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے

مذہبیات

شرف الدین اصلاحی

مستشرقین۔ استشراق اور اسلام

ماہنامہ معارف۔ اعظم گڈھ ستمبر ۱۹۸۲ء
جلد ۱۲۰، شمارہ ۳، ص ۱۶۵ - ۱۸۰

فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلے سے بحث کی ہے کہ اسلام مستشرقین کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

انور الجندی

ترجمہ عمیر الصدیق ندوی

مستشرقین اور اسلام

ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ ۱۹۸۲ء
جلد ۱۳۰، شمارہ ٦ ص ۴۰۵ - ۴۲۳

بنیادی طور پر اسلام کے بارے میں مستشرقین کا موقف ان کے مغربی طرز کے مذہبی فہم وادراک سے ماخوذ و مستعار ہے۔ یہ فہم بیک وقت کوتاہ، محدود اور کمزور ہے کیونکہ اس کی بنیاد اسلام کی وہ تشریحیں اور تعبیریں ہیں جن کو یہودی عالموں اور پادریوں نے پیش کیا ہے۔

تنزیل الرحمن

اسلام اور ربا

ماہنامہ فکر و نظر۔ اسلام آباد۔ نومبر ۱۹۸۲ء
جلد ۲۰۔ شمارہ ۵۔ ص ۴۴ - ۵۴

ربا کے لفظی معنی «زیادتی» کے ہیں۔ شریعت میں ایک خاص قسم کی زیادتی کو ربا کہتے ہیں ربا قرض کی واپسی میں مدت مقررہ کا معاوضہ ہے اور یہ مدت چونکہ مال نہیں ہے لہذا اس مدت کا عوض ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں سود کی ممانعت کے بارے میں پہلے ایک حکم دیا گیا جو ابتدا ہی جگہ قائم رہا۔ دوسرے حکم کے ذریعے اس کی تکمیل کی گئی اس طرح سودی کاروبار کی مکمل تحریم کا حکم دیا گیا ہے۔ متعدد احادیث مروی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سودی کاروبار کی ممانعت کا قطعی اعلان فرمایا ہے۔

سود نہ صرف اسلامی مملکت کے اپنے ممنوع ہے بلکہ اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہریوں کیلئے بھی ممنوع ہے۔ در حقیقت سود ایک عالمگیر لعنت ہے۔ جسے جدید معاشیین بھی مانتے ہیں۔

محمد برہان سنبھلی

بینک سے تعاون اور اس کے
انٹرسٹ کا شرعی حکم

ماہنامہ برہان، دہلی۔ مارچ ۱۹۸۳
جلد ۹۰۔ شمارہ ۳۔ ص ۴۱ - ۵۵
اپریل ۱۹۸۳ جلد ۹۰ شمارہ ۴ ص ۳۳ - ۴۷

سود کا اسلامی نقطہ نظر سے قابل احتراز بلکہ قابل نفرت ہونا اتنا معروف ہے کہ بتانے کی ضرورت نہیں تاہم سود کی شناعت اور مذمت کے بارے میں جو نقوص وارد ہوئے ہیں ان کا تذکرہ خالی از فائدہ نہیں ہے

خواجہ احمد فاروقی

مستشرقین کے تصور اسلام کا
تاریخی پس منظر

ماہنامہ معارف۔ اعظم گڈھ۔ نومبر ۱۹۸۲ء
جلد ۱۳۰۔ شمارہ ۵ ص ۳۲۵ - ۳۳۶

جب اقوام مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا شروع کی تو اس کی ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ ان کی زبانوں کو۔ انکے مذہب کو اور انکی تہذیب و تمدن کو سمجھیں اور ان کو اپنے رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃً اعلیٰ و ارفع نظر آئے۔

سید عبدالرحیم

قرون وسطیٰ کے مسلم سکے اور کتبے
ماہنامہ جامعہ۔ نئی دہلی، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۲

جلد ۴۹ ۔ شمارہ ۱۱ ـ ۱۲ ۔ ص ۴۰ ـ ۵۵

مسلم سلاطین ہند نے سونے ۔ چاندی ، تانبا اور مرکب دھات کے سکے مضروب کروائے سونے اور چاندی کے ہم وزن سکوں کو تنکہ یا ٹنکہ کہا جاتا تھا اسے درہم بھی کہتے تھے اس کا وزن ۹۶ رتی تھا چتیل بھی ایک تنکۂ سیم (روپئے) کے برابر ہوتا تھا۔ مرکب دھات کے سکے «دھلی دال» کے مرادف تھے جو «گانی» کہلاتے تھے اس کی قیمت کی وضاحت کے لئے تنکہ رائج ۔ نصفی ۔ ہم شرعی دوگانی ۔ ہشت گانی اور پنجاہ گانی وغیرہ نام دئے گئے تھے ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کے سکوں میں ہندو مذہب اور اور ہندو تہذیب کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ مسلم بادشاہوں نے اپنی شبیہہ سکوں پر سوا کر ہندوستانی تہذیب سے ہم آہنگی پیدا کی ، سکوں کے ایک رخ پر عربی عبارت کندہ کروائی اور دوسری جانب سنسکرت عبارت لکھوائی ۔

سلاطین غزنویہ ، سلاطین غوری ، غلام سلاطین ، سلطان خاندان تغلق ، سلاطین خاندان سور ، اور سلاطین مغلیہ کے سکوں کا اجمالی جائزہ بھی لیا ہے ۔

مسلم سلاطین نے بھی فرمان چٹانوں پر کندہ کر کے لگوائے فارسی کے نیچے دیو ناگر میں اسکی نقل پیش کی جاتی تھی۔

سید عبدالقدوس ہاشمی

جین مت (جین ازم)

ماہنامہ فکر و نظر ، اسلام آباد ، دسمبر ۱۹۸۲ء
جلد ۲۰ ، شمارہ ۶۱ ، ص ۱۲ - ۱۵

ہندوستان میں جین مت کے آغاز اور اشاعت۔ جینی عقائد و افکار۔ جینی مشاہیر (قدیم و جدید) کا تذکرہ ہے تفصیلات ہیں۔ مہا بیر کی تعلیمات کی توضیح کی ہے

محمد عبداللہ طارق

سرجری اسلام کے قرون اولیٰ میں

ماہنامہ برہان دھلی ۔ جنوری ۱۹۸۳ء
جلد ۹ ، شمارہ ۱ ،ص ۵ - ۲۲
فروری ۱۹۸۳ جلد ۹۰۔ شمارہ ۳، ص ۵-۱۹
مارچ ۱۹۸۳ء جلد ۹۰۔ شمارہ ۳، ص ۵-۱۳

ان اقساط میں علم التشریح و منافع الاعضاء قرآن اولیٰ میں سرجری کی عمومیت ، تابعین اور ائمہ کرام و خلفائے اسلام کی اس سے واقفیت ۔ پیٹ کے بڑے آپریشن، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں کمر کا آپریشن مسخ شدہ اعضاء کی اصلاح و تکمیل اور فوت شدہ اعضاء کے تبادل

مصنوعی اعضاء کی تنصیب اور اسکے لئے
سوی ہدایات یعنی پلاسٹک سرجری۔ سونے
کی ناک ۔ سونے سے دانتوں کی بندش ،
دانتوں پر سونے کا خول چڑھانا۔ چند قدیم
مسلم سرجن ، حسن و جمال کی غرض سے
پلاسٹک سرجری۔ سرجری میں مسلمانوں
کے کارنامے ۔ آپریشن سے احتیاط اور
اس کی متبادل حیرت انگیز تدبیریں ۔ آنکھ
کا آپریشن۔ سرجری پر کتابیں جیسے
موضوعات کا احاطہ کیا ہے

محمد عبداللہ طارق

سرجری اسلام کے قرون اولٰی میں

ماہنامہ برہان ، دہلی ، ستمبر ۱۹۸۲ع
جلد ۸۹ ۔ شمارہ ۳ ، ص ۶-۲۳

اہل اسلام نے یونانیوں ۔ کلدانیوں
اسکندریوں ۔ عراقیوں اطباء جزیرہ ۔اطباء
دیار بکر ، اطباء ہند ۔ اطباء مغرب مراکش
وغیرہ اور اطباء مصروشام کے علوم طب
و جراحت کو صرف اپنی زبان میں نقل
کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انمیں مہارت
پیدا کر کے ان کو ترقی کی معراج پر
پہنچا دیا

اس قسط اولیں میں سرجری کے قدیم
و جدید نام آغاز ، یونانی سرجری ، عربوں
کی سرجری ، حجامت ۔ پچھنے لگانا، فوائد
و نقصانات حجامت ، کئی (داغنا)، فصد اور
قطع عروق پر روشنی ڈالی ہے ۔

شخصیات

انیس اشفاق

البئر کامیو

ماہنامہ شب خون ۔ الہ آباد ، دسمبر ۱۹۸۲
جنوری ۱۹۸۳ع ، جلد ۱۷ ، شمارہ ۱۲۷ ،

البئر کامیو ۷ نومبر ۱۹۱۳ع کو الجزائر
کے قصبہ مونڈوی میں ایک بہت غریب اور
محنت کش خاندان میں پیدا ہوا اس نے
۱۹۳۶ع کے آس پاس لکھنا شروع کیا ۔
۱۹۳۸ع میں کامیو کی سرگرمیوں کا تعلق
ادب ۔ فلسفہ ۔ تھیٹر ۔ صحافت اور سماجی
انصاف تھا ۔ ۱۹۴۲ع میں « بیگانہ » اور
اور ۱۹۴۳ع میں «سی سی فس کی روایت»
کی اشاعت نے کامیو کو آناً فاناً مشہور
کر دیا

کامیو کے مضامین ۔ افسانے اور ناول
سب کا تعلق الجیریا سے ہے اس نے
جمہوری فلسفے کی بہت سی راہیں دریافت
کیں

کامیو پر اب تک تین ہزار مضامین لکھے
جا چکے ہیں ۔ یونیسکو کے جائزے کے

مطابق۳۲ غیر ملکی زبانوں میں اس کی تصنیفات کا ترجمہ ہو چکا ہے ۔

اس کے تخلیقی کارناموں پر ۱۹۵۷ع میں نوبل انعام دیا جا چکا ہے ۔

شمس بدایونی

سید میر محفوظ علی

(کچھ غیر معروف حالات)

ماہنامہ جامعہ نئی دھلی ، اکتوبر ۱۹۸۲ع
جلد ۷۹ ، شمارہ ۱۰ ، ص ۳۸ - ۴۸

میر صاحب بدایوں کے ایک خوشحال گھرانے میں ۱۸۷۰ع کو پیدا ہوئے ۔ میر صاحب نے ابتدائی تعلیم مولوی عبدالتعالی سے ان کے مکتب میں پائی ۱۸۸۶ع میں مشن ہائی اسکول بدایوں سے مڈل کا امتحان پاس کیا ۔ ۱۸۵۰ع میں علیگڈھ ایم او کالج سے بی اے کیا یہاں شوکت علی اور محمد علی سے خاص روابط ہو گئے ۔

اس کے بعد مختلف مقامات پر جج کے عہدے پر فائض رہے ۔

ہمدرد وکامریڈ میں میر صاحب ایک مددگار اور مشیر خاص کی حیثیت رکھتے تھے ۔

میر صاحب نے کئی قلمی ناموں سے مضامین لکھے ۔ ایک سے جب مشہور ہو جاتے تو دوسرا اختیار کرتے ۔ ملانے سو مالی ، ملا علی کانت بودھامنوی ، ملا علی آق سقال ، سمعب ، مضمون العلیٰ ۔شمع بے نور وغیرہ ان کے دیگر قلمی نام ہیں اصل نام سے بھی مضامین لکھے ہیں ۔

ایس ایس شاہ

گیبرل گارسیا مارکوئز

دو ماہی الفاظ علیگڈھ نومبر دسمبر ۱۹۸۲ع
جلد ۷ ، شمارہ ۶ ص ۱۰۱ - ۱۰۳

گیبریل گارسیا کولمبیا کا ہسپانوی نژاد ناول نگار ہے ۔ « تنہائی کے سو سال » نامی ناول اس کا شاہکار سمجھا جاتا ہے ۔

اس کا ناول «تنہائی کے سو سال» ایک شہر کے آباد ہونے ، پھلنے بڑھنے اور ایک خاندان کی چھ نسلیں گذرنے کی داستان ہے ۔ ناول کے وسیع کینواس پر امریکہ کی دریافت ۔ کولمبیا کی تاریخ اور گارسیا کے اپنے خاندان کی تفصیلات پھیلی پڑی ہیں ۔

گارسیا کےادبی مزاج پر کافکا فاکنر اور اس کے دادا جو اسے عجیب عجیب لمبی کہانیاں سنایا کرتے تھے ، اثر انداز ہوئے ہیں

سیاسی نظریے کے اعتبار سے وہ سوشلسٹ ہیں ۔

قاضی اطہر مبارکپوری

امام ابو حفص ابن شاہین بغدادی

ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ستمبر ۱۹۸۲ع
جلد ۱۳۰ ۔ شمارہ ۳ ص ۱۸۱ - ۲۰۴

ابن شاہین فقہائے محدثین میں سے تھے جو فقہی آراء و احکام میں اجتہاد و قیاس کے مقابلے میں احادیث و آثار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور کسی خاص فقہی مسلک کی بجائے روایت و درایت کے اصول پر عمل کرتے ہیں ۔

امام ابن شاہین جن علوم میں خاص شہرت رکھتے تھے ان میں تفسیر اور تجوید و قرآت بھی ہے وعظ گوئی میں بھی خاصی شہرت رکھتے تھے ابن شاہین ثقہ و مامون حافظ حدیث اور محدث عراق ہونے کے ساتھ ساتھ زہد و مشیحت میں ممتاز درجہ رکھتے تھے انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا

انہوں نے تین سو تیس کتابیں لکھی ہیں

ان کی ولادت ۲۵۱ ھ میں ہوئی ۔ ان کی وفات پنجشنبہ ۴ ربیع الاول ۴۴۰ ھ میں ہوئی اور دوسرے دن باب حرب کے قبرستان میں دفن کئے گئے

محمد اسلم

نواب مرتضی خان فرید بخاری

ماہنامہ برہان دھلی ۔ ستمبر ۱۹۸۲ع
جلد ۸۹ ، شمارہ ۳ ، ص ۴۴ - ۵۳

شیخ فرید کا شمار مغلیہ دور کے ان نامی امراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اس دور کے سیاسی ، سماجی اور دینی حلقوں میں اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ۔

شیخ فرید اکبر کے عہد میں دھلی میں پیدا ہوئے اور کمسنی ہی میں اکبر کے دربار میں باریاب ہوئے ۔ اکبر کو ان پر بڑا اعتماد تھا اور وہ ان سے بڑے اہم کام لیا کرتا تھا

سمیع اللہ

فورٹ ولیم کالج اور فورٹ سینٹ جارج کالج

ماہنامہ جامعہ ، نئی دھلی ۔ ستمبر ۱۹۸۲ع
جلد ۷۹ ، شمارہ ۹ ، ص ۱۲ - ۲۴

عام طور پر فورٹ ولیم کالج (جس کی داغ بیل ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ع میں گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے ڈالی) کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کا پہلا ادارہ تھا جسے کمپنی کے ملازمین کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے قیام سے لگ بھگ تراسی (۸۳) سال قبل مدراس پریسیڈینسی کے رائٹرس کی تعلیم کے لئے ۱۷۱۷ع

میں فورٹ سینٹ جارج میں ایک اسکول کی بنیاد ڈالی جسے رانڈس کالج کہا جاتا تھا بعد میں یہی ادارہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے نام سے مشہور ہوا۔

جہاں تک اس کے نصاب کا تعلق ہے وہ فورٹ ولیم کالج کے نصاب کی ہمسری تو نہیں کر سکتا لیکن اس کی وسعت و ہمہ گیری سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا اس میں بھی عربی، فارسی، سنسکرت کے علاوہ ہندوستانی تامل ملیالم کنڑ کے علاوہ قانون اور ریاضی کی تعلیم کی بھی گنجائش رکھی گئی تھی۔

فورٹ ولیم کالج اور فورٹ سینٹ جارج کالج میں تعلیم و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے شعبے بھی قائم تھے

جنوبی ہند میں اردو کی ترویج و اشاعت میں فورٹ سینٹ جارج نے وہی کردار ادا کیا ہے جو شمال میں فورٹ ولیم کالج نے

فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کا مقصد اور موضوع محدود تھا وہاں زیادہ تر توسیع لغت، قواعد، تاریخ اور داستانوں پر دی گئی جبکہ یہاں ان مضامین کے علاوہ قوانین، صنعت و حرفت اور ریاضی سے متعلق بھی کتابیں تصنیف کی گئیں

فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے کے مقابلے میں فورٹ سینٹ جارج کا کتب خانہ بعض اعتبار سے ایشیا کے بڑے کتب خانوں میں انفرادی حیثیت کا مالک تھا۔ اس میں عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور ہندوستانی (اردو۔ ہندی) کے علاوہ تامل، تیلگو، کنڑ، ملیالم، مرہٹی بنگلہ، اڑیا، برمی اور جاوی کتابوں کے مطبوعہ اور قلمی نسخے کافی تعداد میں موجود تھے

ان دونوں کالجوں کا ایک اہم کارنامہ یہ کہ ان کے ارباب حل و عقد نے ہندوستانی زبان کو مشینی دور میں داخل کیا

یہ دونوں کالج ۱۸۵۴ء کے اوائل میں ختم کر دئے گئے

خواجہ حمید یزدانی

ہیر رانجھا (فارسی) از یکتا

ماہنامہ المعارف، لاہور دسمبر ۱۹۸۲ء

جلد ۱۵ شمارہ ۱۲ ص ۳۳ - ۵۰

فارسی میں کئی ایک شعراء نے یہ داستان نظم کی ہے تاہم اس مضمون میں نواب احمد یار خاں المتخلص یکتا کی مثنوی ہیر رانجھا سے بحث کی گئی ہے

فارسی میں لکھی گئی مثنویاں مختصر ہیں یکتا کی مثنوی ہیر رانجھا مطبوعہ لاہور

۱۳۰۸ اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس کا سالِ تالیف معلوم نہیں ۔

یکتا نے سادہ و عام فہم تشبیہات و استعارات و کنایات سے کام لیا ہے ۔ اس کے بعض اشعار سہل ممتنع کی اچھی مثالیں ہیں ۔ کسی موقع پر بھی اس نے سادگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ۔

شہپر بیاری

آدم جنتِ ارضی میں

ماہنامہ المعرف لاہور ، دسمبر ۱۹۸۲ء
جلد ۱۵ ۔ شمارہ ۱۲ ، ص ۱۳ ـ ۲۲

اس کرہ ارضی پر انسانی زندگی کی ابتدا کے متعلق دو بڑے نظریے کار فرما ہیں ۔ اول تخلیق اور دوم ارتقاء نظریہ ارتقاء ڈاروں نے پیش کیا تھا جو اب قابلِ قبول نہ رہا

فاضل مقالہ نگار نے بڑی دلچسپ بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سب سے پہلا انسان ، اس کی بیوی اور بچے جنت ارضی یعنی اٹلانٹس میں رہتے تھے جو ساحل اندلس سے چھ سو میل دور تھی وہاں پہلی بار میاں بیوی جنت ارضی سے جو پہاڑ پر تھی نیچے آئے ، بچوں نے کھیتی باڑی کی اور جب اٹلانٹس ڈوبنے لگا تو اللہ نے پھر ان کو بچا کر ساری دنیا میں پھیلا دیا ۔ قرآن حکیم کا بیان اھبطوا اور اھبطوا منھا جمیعا قطعی طور سے صحیح ہے ۔ کوئی سمجھ نہ سکے تو یہ الگ بات ہے ۔

عبدالمغنی تبسم

علامہ سید سلیمان ندوی کا علمی کارنامہ

ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ۔ دسمبر ۱۹۸۳ء
جلد ۱۳۰ ، شمارہ ٦ ۔ ص ۴۲۳ ـ ۴۲۴

سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کو پروان چڑھایا ۔ ندوۃالعلماء کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا دار المصنفین کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ «معارف» جاری کیا ۔ سیرۃ النبی کی تکمیل کی سیرت عائشہ مرتب کی ۔ عرب و ہند کے تعلقات کا سراغ لگایا ، خطبات مدارس دئیے ، نقوش سلیمانی تحریر کئے ۔ عمر خیام کی حقیقت و اہمیت واضح کی اور تاریخ اسلام سے لے کر سیرۃ الصحابہ اور بزم صوفیہ تک تصنیف کرائی

۰ ۰ ۰ ۰

مقالہ نما ذیل کے رسائل سے ترتیب دیا گیا ہے

الفرقان — ماہ نامہ
(مدیر محمد منظور نعمانی)
۳۱ ، نیا گاؤں (مغربی) لکھنؤ

برہان — ماہ نامہ
(مدیر سعید احمد اکبر آبادی)
اردو بازار ، جامع مسجد ، دہلی ٦

شب خون — ماہ نامہ
(مدیرہ : عقیلہ شاہین)
۳۱۳ ، رانی منڈی ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

المعارف — ماہ نامہ
(مدیر محمد سعید شیخ)
ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ لاہور

شاعر — ماہ نامہ
(مدیر . افتخار امام صدیقی)
مکتبہ قصر الادب ، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲٦ ، بمبئی ۸

نوائے ادب — ششماہی
(مدیر . نظام الدین ایس گوریکر)
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

سب رس — ماہ نامہ
(مدیر مغنی تبسم)
ادارۂ ادبیات اردو . ایوان اردو
حیدرآباد (آندھرا)

جامعہ — ماہ نامہ
(مدیر . ضیاالحسن فاروقی)
جامعہ ملیہ اسلامیہ ، نئی دہلی ۲۵

الفاظ — دو ماہی
(مدیر احمد سعید خان)
ایجوکیشنل بک ہاؤس . مسلم یونیورسٹی
مارکیٹ ، علی گڑھ۔

فروغ اردو — ماہنامہ
(مدیر محمد حسین شمس علوی)
ادارۂ فروغ اردو ، امین آباد پارک ، لکھنؤ

●

رسائل کے مدیروں سے اپیل کی جاتی ہے ، کہ وہ اپنے رسائل و جرائد نوائے ادب میں مقالہ نما کی ترتیب کے لئے ڈائرکٹر کے نام بھیجیں ۔ (مدیر)

Edited by Dr Nizamuddin S Gorekar
Director, Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute, Bombay 400 001
Published by Shri Abdul Majeed Patka
General Secretary Anjuman-i-Islam, Bombay 400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay 400 008

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نواے ادب ، بمبئی

رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰ — Registration No 32009/50

مقام اشاعت: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نوعیت اشاعت: ششماہی

نام پرنٹر: جناب عبدالمجید پالکا، بی، کام (آنرز)

قومیت: ہندوستانی

پتہ: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پبلشر، قومیت، پتہ: ایضاً

نام ایڈیٹر: پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

قومیت: ہندوستانی

پتہ: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پتہ مالک رسالہ: ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

• • •

All remittances & correspondence be made to
Prof N S Gorekar, M A, Ph D, D Litt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

•

Annual Subscription

Inland Rs 10 00 • Foreign Pound 3

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے فروری ۱۹۴۷ء میں الحاق ہوا)

اغراض و مقاصد

۱ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا انتظام کرنا
۲ اور دوسرے تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
۶ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ اردو کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

نوائے ادب بمبئی

(۱۹۵۰ء)

خصوصیات

۱ اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر تبصرے

(سالانہ چندہ : ۱۵ روپیے)

•

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲ ، دادا بھائی نورو جی روڈ ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

REGISTRATION NO. 32009/50

NAWA-E-ADAB

BIANNUAL

ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

نوائے ادب

ششماہی

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲، دادابھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۰۰۱ ۴۰۰

انجمن اسلام کی مجلس عاملہ

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

•

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب مصطفیٰ فقیہ	محترمہ ہمائے پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی
•	•	•
جائنٹ سیکریٹری	اعزازی جنرل سیکریٹری	جائنٹ سیکریٹری
جناب یوسف مراد	جناب عبدالمجید ای پالکا	جناب عبدالستار زری والا

•

اراکین

محترمہ زرینہ کریم بھائی — محترمہ زلیخا مرچنٹ

جناب فیض حسن والا

جناب مامون لقمانی — جناب ہاشم اسماعیل

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

• •

مدعوئین

جناب عبدالقادر حافظکا — جناب عبداللہ فقیہ

• • •

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کمیٹی

چیرمن

جناب مصطفیٰ فقیہ

•

اراکین

جناب عبدالمجید ای پالکا — جناب عبدالستار زری والا

پروفیسر عبدالقادر قاضی

•

سیکریٹری

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

• • •

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تا حال ڈائرکٹران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۴۷ سے ۱۹۶۸ع)

پروفیسر سید ظہیرالدین مدنی (۱۹۶۹ سے ۱۹۷۴ع)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷۵ سے جاری)

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

٭

جلد ۳۳ — شمارہ ۲

اکتوبر ۱۹۸۳ع

مندرجات

انجمن اسلام کے نئے صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب ستمبر ۱۹۸۳ ع کو متفقہ طور پر انجمن اسلام بمبئی کے نئے صدر منتخب ہوگئے ہیں آپ ایک عرصے سے انجمن اسلام کی کارگذاریوں سے وابستہ رہے ہیں آپ نے مہاراشٹر سرکار کی کابینہ میں وزیر مملکت اور ریاستی اردو اکادمی کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دئے ہیں آپ تجربہ کار ہی نہیں بلکہ تنظیمی صلاحیت کے مالک بھی ہیں اور عوام و خواص میں کافی مقبول ہیں

• •

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے پی ایچ ڈی طلبہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کی نگرانی میں جناب ذاکر حسین فاروقی اور ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کے زیر نگرانی پروفیسر خورشید مظہر الحق نعمانی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور حال کے ڈائرکٹر پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر کی نگرانی میں جامعہ بمبئی نے پروفیسر سید شبر علی ، جناب خواجہ عبد الغفور اور سید محمد حسن صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے مستحق قرار دیا ہے

حارث صاحب ـ ایک پہلودار شخصیت

دو شنبہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۳ ع کی شام وہ منحوس شام تھی جب کہ فرشتۂ موت نے ایک بے باک صحافی ، ایک باوقار عالم ، ایک فرض شناش خادم قوم ، ایک بے غرض مجاہد آزادی اور سب سے بڑھکر ایک شریف انسان حارث صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین لیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ـہ

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

معین الدین برہان الدین حارث صاحب ۷۸ سال قبل ۱۸ اپریل ۱۹۰۵ ع کو مہاراشٹر کے ایک تاریخی قصبہ سوپارہ کے ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوئے لیکن دولت و تمول سے بے نیاز رہکر انہوں نے سادہ زندگی بسر کی اور اس طرح ان کی اٹھہ قرنوں کی زندگی سے ایک طرف اصول پرستی ، جرأت مندی اور رواداری کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری جانب محبت و شرافت اور اخلاص و استغنا نمایاں ہوتی ہے ، حارث صاحب جہاں ایک مرنجاں مرنج ، انسان دوست اور اعلیٰ خیالات و بلند حوصلوں کے مالک تھے وہاں وہ قدیم و جدید اسلامی اقدار کے سنگم بھی تھے ۔

حارث صاحب نے ابتدا میں حافظ علیم الدین ٹونکی اور قاری غلام مصطفیٰ بنارسی جیسے اساتذہ سے مکتب میں اردو ، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی مگر جدید نظام تعلیم کے پیش نظر انہوں نے اول مراٹھی ذریعۂ تعلیم اسکول اور بعد میں اردو ذریعۂ تعلیم ثانوی مدرسہ میں داخلہ لیا اور تحریک خلافت کے دوران مصطفیٰ کمال پاشا اسکول میں داخل ہوئے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ملحق تھا اور ۱۹۲۳ ع میں میٹرک پاس کرکے جامعہ ملیہ اسلامیہ (علیگڑھ) میں داخل ہوگئے جب نظریاتی اختلافات کی بنا پر جامعہ نے علیگڑھ سے ہجرت کرکے دہلی کے قرول باغ میں پناہ لی تو حارث صاحب بھی اس قافلہ کے ہمراہ دہلی چلے آئے اور یہاں انہوں نے مولانا اسلم جیراجپوری ، ڈاکٹر عبد الحی فاروقی

مولوی شرف الدین ٹونکی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر سید عابد حسین جیسے علماے ادب اور مخدومین قوم کی نگرانی میں ۱۹۲۷ء میں جامعہ ملیہ کی بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

دراصل وطن دوستی اور حب الوطنی کا سبق انہوں نے جامعہ ملیہ میں پڑھا اور بالعمل فرقہ وارانہ ذہنیت کے سخت ترین دشمن بن گئے۔ جامعہ کی طالب علمانہ زندگی ہی سے لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کے مراٹھی اخبار 'کیسری' اور "نواکال" کے لئے برابر مراٹھی لکھا کرتے تھے اور بعد میں روزنامہ اخبار خلافت (بمبئی) اور بمبئی کرانیکل کے عملہ میں شریک ہوئے اور سید عبد اللہ بریلوی صاحب اور مولانا عبدالباسط جیسے کہنہ مشق صحافیوں کی رہنمائی میں صحافت کے اصول اور اقدار سے روشناس ہوگئے اور صحافت جیسے شریف پیشہ کو سستی شہرت اور وقتی اقتدار کے حصول کی خاطر ملوث نہیں کیا بلکہ اسے پر وقار بنایا ۱۹۲۸ء میں روزنامہ اجمل کی حب حارث صاحب نے ادارت سنبھالی تو اپنے رشحات قلم کے ذریعے اسے نہ صرف متانت و سنجیدگی بخشی بلکہ صحافت کو باوقار بنایا۔ لیکن سیاسی اختلافات اور ناساعد حالات کی بنا پر اجمل کو بند کرنا پڑا اس اخبار کے ہفتہ وار ایڈیشن کے اداریے اور مضامین قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اسی طرح حارث صاحب بزبان انگریزی بمبئی کے ایوننگ نیوز (Evening News) میں شہری کوائف (Civic Causerie) کے عنوان سے ہر ہفتے لکھا کرتے اور حالات حاضرہ کے متفرق پہلوؤں پر تبصرے کیا کرتے۔ قارئین اس کالم کو بڑے شوق سے پڑھا کرتے اور اسکا بڑا بے چینی سے انتظار کرتے۔

صحافتی زندگی میں ہی حارث صاحب کے تعلقات اور روابط ہندوستان کی شہرۂ آفاق شخصیتوں میں مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین جے پرکاش نراین، اچاریہ کرپلانی، مرارجی بھائی ڈیسائی اور اشوک مہتا سے قائم ہوگئے اور ان کی بے لوث خدمت اور پر خلوص انسانی دوستی کی وجہ سے ہر شخص حارث صاحب سے بے حد متاثر ہوتا۔

مہاراشٹر لیجسلیٹیو کونسل کے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۳ء تک رکن رہے اور بلدیۂ

بمبئی کے تیرہ سال تک ممبر منتخب ہوتے اور ہمیشہ حزبِ مخالف کے ایک رکن یا
قائد کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ہندوستانی پریس کمیشن (پہلے
اور دوسرے) کے ممبر نامزد کئے گئے اور حج کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے
اپنی خدمات تین سال تک بخوبی انجام دیں۔ وہ فلم سنسر بورڈ کے ۱۲ سال
تک نامزد رکن رہے اور جامعہ بمبئی کے فیلو بھی بنائے گئے۔ نیشنل کانگریس کمیٹی کے
۱۹۳۰ع میں ممبر تھے لیکن اختلاف رائے کی وجہ سے بعد میں سوشلسٹ پارٹی میں
شریک ہوئے اور اس کے فوراً بعد اچاریہ کرپلانی کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے
فعال ممبر رہے۔ جب سمیکت مہاراشٹرہ سمیتی بنی تو وہ اس کے ممبر بنائے گئے اور
بلدیۂ بمبئی میں مخالف پارٹی میں رہکر اس کی قیادت کی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں
مرارجی بھائی دیسائی اور اچاریہ جے پرکاش نرائن کی سرکردگی میں جنتا پارٹی کی
رکنیت قبول کی اور اسکے سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ حارث صاحب
نے تحریک ستیا گرہ میں بھی حصہ لیا اور دو مرتبہ ۱۹۴۱ع اور ۱۹۴۲ع میں حکومت
برطانیہ نے انہیں گرفتار کرلیا تھا۔

حارث صاحب گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا میں بھی شریک ہوئے اور حج وفد
کے ممبر کی حیثیت سے سعودی عرب گئے اور انہوں نے نہ صرف اسلامی ممالک کا
دورہ کیا بلکہ مغربی ملکوں کا بھی سفر کیا۔

حارث صاحب یوسف مہر علی میموریل ایجوکیشن سوسائٹی اور انجمن اسلام
بمبئی کے بلا مقابلہ ایک عرصے تک صدر منتخب ہوئے اور اپنی خدمات پرخلوص اور
احسن اور طریقے پر انجام دیں۔ حارث صاحب کی دوران صدارت میں وزیر اعظم
جمہوریۂ ہند محترمہ اندرا گاندھی نے فروری ۱۹۸۲ع میں راج بھون بمبئی میں انجمن
کے اراکین کو شرف ملاقات بخشا اور انجمن کے کارناموں کی داد دی اور ہر ممکن
تعاون کا یقین دلایا۔

حارث صاحب کے ذاتی کتبخانہ میں سینکڑوں نایاب اور قیمتی کتب و رسائل
تھیں۔ انکے برادر عزیز رضوان حارث صاحب نے اس ذخیرہ کو انجمن اسلام اردو
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو بطور عطیہ پیش کیا ہے جو انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں مرحوم
معین الدین حارث کلکشن (Late Moinud-Din Harris Collections) کے نام سے
موسوم کیا جائیگا۔

بمبئی میں انجمن اسلام اور دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے حارث صاحب کو دلی لگاؤ تھا ۔ جامعہ تو انکا مادر علمی (Alma Mater) تھا جہاں انہوں نے انسانی اقدار اور زندگی کے اصولوں کی صحیح تعلیم پائی اور جسکا اظہار بڑی جرأت مندی اور خوش اخلاقی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں کیا ہے ان کی تحریر و تقریر دونوں سے خوف و ہراس یا امید و رجا کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی اور وقار تھا اور تقریر میں زور تھا انجمن اسلام میں حاضری اور اسکی خدمت یہ انکی زندگی کا پیارا مشغلہ تھا اور اسکی مختلف مجلسوں کی رکنیت کو باعث عزت تصور کرتے تھے بلکہ کوئی سات سال تک ایک فعال صدر کی حیثیت سے بر امکانی خدمت انجام دیتے رہے ۔ ان کا یہ شغف تھا کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں سے زیادہ وقت سماجی کاموں کے لئے دیتے اور عوام کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہر ممکن مدد کیا کرتے

اسلامیات سے دلی شغف ہونے کے باعث انہوں نے سالانہ سیرت تقاریر کے اہتمام اور انعقاد کی خاطر ایک فنڈ انجمن میں قائم کیا اور کوئی تین چار سال سے ہر سال انجمن اسلام کے تحت تقاریر کا سلسلہ شروع کردیا اسلامیات کے ماہرین جو اردو یا انگریزی میں تقریر کرسکتے ہیں انکو تقریر کرنے کی غرض سے دعوت دی جاتی ہے اور یہ تقاریر بعد میں شائع کی جاتی ہیں

حارث صاحب الغرض ایک پرخلوص اور سچے مسلمان ہی نہیں بلکہ روشن خیال اور وسیع النظر انسان تھے ۔ انسان دوستی کے نقطۂ نظر سے دوسرے مذاہب میں ہندومت اور عیسائیت کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس طرح تعصب اور فرقہ واریت کے ازلی دشمن بن گئے ۔

اللہ تعالی حارث صاحب جیسی دیندار مگر دنیا کی ذمہ داریوں سے باخبر اور دنیادار لیکن دین کے اصولوں کی پابند ہستی کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہمیں انکے نقش قدم پر چلنے اور انکے نیک مشن کو آگے بڑھانے کی توانائی عطا کرے ۔

امین دعا از من و از جملہ جہان امین باد

(پروفیسر) نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

محمد انصاراللہ
سر سید نگر، علیگڑھ

زبانِ اردو کی ابتداء

بادشاہ ظل اللہ ہوتا تھا اس کی ذات جامع کمالات، اور جس شہر کو وہ اپنا مستقر بنا لیتا تھا وہی تمام علوم و فنون کا سر چشمہ بن جاتا تھا اس لیے اس خیال کو بہت زیادہ رواج ہوا کہ زبان اُردو کی ابتداء اس وقت ہوئی جب ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ع میں ابوالمظفر شہاب الدین شاہجہاں نے شہر شاہجہاں آباد کو بسا کر بازار اردوے معلی کو مرتب کیا۔ کہا گیا ہے کہ اردو کا نام اسی بازار کی مناسبت سے "زبان اُردو معلی" پڑا۔ کثرت استعمال سے مخفف ہوکر وہی "اُردو" رہ گیا کہنے کو مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کہدیا کہ:

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی"

لیکن عقیدہ ان کا بھی وہی تھا چنانچہ آب حیات کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے کہ

> "ایک بچہ شاہجہانی بازار میں پھرتا ملے، شعرا اسے اٹھا لیں اور ملک سخن میں پال کر پرورش کریں، انجام کو یہاں تک نوبت پہونچے کہ وہی ملک کی تصنیف و تالیف پر قابض ہوجاے" (آب حیات ص۱)

اس عام عقیدے سے ہٹنے کی پہلی باقاعدہ اور شعوری کوشش حافظ محمود خاں شیرانی نے کی۔ انھوں نے اپنی عالمانہ تصنیف "پنجاب میں اُردو" میں ان مسائل سے بحث کی "جن کی رو سے پنجاب اس زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کا گہوارہ مانا جاسکتا ہے" اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

> "اردو زبان کے آغاز کا سر زمین پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے اس سے پیشتر پنڈت کیفی یہ عقیدہ خود مذاق کے طور پر اور شیر علی خاں سرخوش اپنے پر لطف تذکرہ اعجاز سخن میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرچکے ہیں مگر اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے۔"

« پنجاب میں اُردو » حافظ صاحب کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ اس کتاب کی تکمیل پر انھوں نے جو غیر معمولی مشقت اٹھائی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو کوئی نئی بات پیش کردینے کی توفیق ہوئی ہو۔ یہ اس کتاب کا حق تھا کہ اس کی بیش از بیش پذیرائی ہوتی۔ پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے ۱۹۲۹ء میں اس پر ایک ہزار روپے کا انعام دیا گیا، اور جلد یا بدیر ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں اس کو شامل کیا گیا۔

یہ کتاب لکھنے کے وقت حافظ صاحب کے سامنے ایک متعین مقصد تھا۔ اس تعین نے تحقیقی نقطۂ نظر سے بہت نقصان پہنچایا ورنہ ان کی جیسی صلاحیت کے انسان کے لیے حقیقت تک رسائی حاصل کرلینا اس قدر مشکل نہ تھا۔ مقالات شیرانی کی جلدوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ « پنجاب میں اُردو » کی تالیف کے بعد جیسے جیسے نیا مواد سامنے آتا گیا وہ حقیقت تک بڑھتے گئے، ان کی رائے میں تبدیلی آتی گئی یہاں تک کے آخر زمانے میں اردو کے مواد کی حیثیت سے وہ پنجاب سے بہت دور پہنچ گئے تھے۔

مشہور مستشرق سر جارج ابراہم گریرسن اور فاضل لسانیات ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی کی تحقیقات کو بنیاد بنا کر زمانۂ مابعد میں « تشکیل ایک نئے نظریے کی » کی گئی اور اس بناء پر کہ اردو میں اسما اور افعال کی بعض حالتوں میں « آ » (الف کشیدہ) کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ اردو کا تعلق میرٹھ اور دہلی کے آس پاس کے علاقے کی بولی « کھڑی بولی » سے ہے اور چونکہ جدید ہندی (جو دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے) بھی اسی کھڑی بولی پر مبنی ہے بالواسطہ طور پر یہ اعتراف بھی کیا گیا کہ اردو اور ہندی یا تو ایک دوسرے کی بہن ہیں یا ایک ہی بولی (کھڑی بولی) کے دو روپ ہیں۔ یہ ساری بحثیں چونکہ تحقیق کے بجائے « ادعا » پر مبنی ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زبان اُردو کی ابتدا سے متعلق بعض دعوے اور بھی کیے گئے ہیں لیکن محض دعووں سے بات نہیں بنتی حقائق اور واقعات پر بھی نظر ہونی ضروری ہوتی ہے۔

ہندوستان میں ظہور اسلام سے پہلے سے عرب تاجروں کی آمد و رفت کا سلسلہ تھا لیکن چونکہ اپنے مال کی کھپت کے سوا ان کا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا تھا ان کا حلقۂ اثر بھی بہت محدود تھا، عوام سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی، ان کے جو کچھ معاملات تھے امرا اور زیادہ سے زیادہ تجار سے تھے نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زبان کے کچھ الفاظ ہندوستانیوں کی زبانوں پر جاری ہوئے تو کچھ ایسی اصطلاحات بھی تھیں جن کو یہاں کی بولی سے انھوں نے اخذ کرلیا اور وہ عرب پہنچ کر وہاں کی زبان میں دخیل ہوگئی۔ پروفیسر محمد مسعود احمد کا خیال ہے کہ ایسے دو ایک لفظ قرآن پاک میں بھی محفوظ ہوگئے ہیں مثلاً طوبیٰ (جنت) اور سندس (ایک باریک ریشمی کپڑا) وغیرہ (نوائے ادب جولائی ۱۹۶۶ع)

عرب سیاحوں اور تاجروں نے ہندوستان کی بولیوں کے لیے ایک عام اصطلاح «ہندیہ» استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کے تحت سنسکرت اور بعض پراکرتیں وغیرہ بھی آجاتی تھیں اس میں شبہ نہیں کہ ان عربوں نے ہندوستان کی بولیوں کو سیکھنے کی شعوری کوشش بھی کی تھی چنانچہ ابو ریحان البیرونی کی کاوشوں کا ذکر خصوصیت سے کیا جا سکتا ہے۔ سہ ماہی نوائے ادب کے جولائی ۱۹۶۵ع کے شمارے میں ایک بہت قدیم ناٹک کا تعارف شائع ہوا ہے اس میں مذکور ہے کہ۔

> قیاساً محمد غوری کے عہد سے بھی پہلے عبدالرحمان نامی کسی شخص نے سیندیس راسک کے نام سے ایک منظوم ناٹک لکھا تھا۔ اس کے بارے میں بس یہ معلوم ہے کہ وہ مغرب کی سمت میں میچا نام کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کے باپ کا نام میر سین بتایا گیا ہے جو کپڑا بننے والا تھا یہ ناٹک پراکرت میں ہے۔ عبدالرحمان نے سنسکرت پراکرت اور پشاچی بھاشاؤں کی جاننے والوں کی تحسین کی ہے»

اس زمانے تک سنسکرت، پراکرت یا پشاچی بھاشاؤں کا علم حاصل کرنا انفرادی فعل تھا۔ اس قسم کی کوشش لسانی اعتبار سے نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی تھیں کیونکہ ان اکتسابات کا تعلق عوامی حلقوں سے نہیں تھا۔

مسلمان اس ملک میں دیانت اور اخوت کا پیغام لیکر آئے وہ ایسے معتقدات

کی ترویج واشاعت چاہتے تھے اونچی ذات والے اور مقتدر طبقے کے مقابلے میں پسماندہ عوام میں ان کے پیغام کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی ۔ مسلمانوں کے لیے ان سے رابطہ پیدا کرنا زیادہ ضروری تھا یہ کام سنسکرت ، پراکرت یا پشاچی زبانوں کے واسطے سے ممکن نہیں تھا اس لیے عوامی سطح کی بولیوں کی طرف توجہ ضروری تھی ۔ اس قدیم زمانے میں ملک کے طول وعرض میں جو بولیاں رایج تھیں ان کا پتا خواجہ امیر خسرو نے اپنی مثنوی '' نہ سپہر ، میں دیا ہے ۔ کہتے ہیں ع

سندی ولاہوری وکشمیری وڈگر دھور سمندری وتلنگی گجر
معبری وگوری وبنگالی واود دہلی وپیرا منش اندر ہمہ حد

ان سب بولیوں کے بارے میں خواجہ کا کہنا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنی خاص اصطلاحیں تھیں جو دوسری بولی سے '' عاریت ،، نہیں لی گئی تھیں ع

معطانے خاصہ ، نہ از عاریتے

اس بنا پر یہ سب ایک دوسرے سے منفرد اور بجائے خود مستقل حیثیت رکھتی تھیں ۔ ہندوستان کے تمام باشندے مختلف عقیدوں اور ذاتوں میں منقسم ہونے کے باوجود باہر سے آنے والے مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر « غیر » تھے ۔ یہاں کی تمام زبانیں ، الگ الگ لسانی رشتوں سے تعلق کے باوجود ان کے لیے برابر اجنبی تھیں ۔ انھوں نے ان سب کو '' ہندوی ،، یعنی ہندوؤں کی زبان کا نام دیا ۔ خواجہ امیر خسرو کہتے ہیں ع

این ہمہ ہندویست کہ زایام کہن عامہ بکار است بہر گونہ سخن

انھوں نے اپنے کلام میں عموماً اسی اصطلاح '' ہندوی ،، کا استعمال کیا ہے ۔

مسلمانوں کی مذہبی ، سیاسی اور معاشرتی ضرورت یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے عوامی طبقے سے زیادہ سے زیادہ قریب آئیں ۔ برہمن یہاں کے قدیمی مذہب کے عالم تھے ، اس کی حفاظت کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھتے تھے ۔ راجپوت حکمراں تھے ، وہ کسی دوسرے کی بالادستی کو خواہ وہ عقیدتمندی ہی کے سبب ہو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوسکتے تھے ۔ پورب دیس میں جہاں کے عوام

غریب اور پسماندہ تھے اور جہاں راجپوتانہ اور دہلی کی جیسی مضبوط حکومتیں بھی قایم نہیں تھیں، برابری، بھائی چارے اور حق پرستی کے اس پیغام کے بیش از بیش مقبول ہونے کے امکانات موجود تھے کہ جو مسلمان لیکر آئے تھے۔

پورب دیس سے مسلمانوں کے دلچسپی لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زمانۂ قدیم سے ان میں یہ خیال چلا آتا تھا کہ۔

«حضرت آدم صفی اللہ علیہ وعلیٰ نبینا وآلہ الصلوٰۃ والسلام کا ورود بہشت سے پہلے ہندوستان ہی میں ہوا اور آپ کا تکلم ابتداءً اسی ملک میں واقع ہوا۔»
(تلخیص معلا ص ٦٥)

اس موقعہ پر یہ ذکر مفید ہوگا کہ مسلمان سلطنت کے قیام کے زمانے میں دکن، پنجاب، دہلی اور بنگال سے «ہند» کو الگ کرتے تھے۔ ہند سے ان کی مراد عموماً دوآبے کے علاقے سے ہوتی تھی چنانچہ آیندہ اوراق میں حسب موقع اس بات شواہد بھی پیش کیے جائینگے۔ حضرت آدم کے اس مخصوص علاقے میں ورود کے بارے میں مسلمانوں کے تمام فرقوں میں اتفاق معلوم ہوتا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی (نویں صدی ہجری) کی ایک تصنیف «مناقب محمدی» یعنی سوانح حضرت سید محمد امجھوری (امجھر ضلع گیا) مرتبہ علی شیر شیرازی مرید خاص حضرت امجھوری میں ہے کہ۔

«بعضے از محققاں نوشتہ اند، مصحف آدم نیز بہ زبان ہندوی بود»
(معاصر ۱۴ ص ۸۰)

گرچہ اب ان «بعضے از محققاں» کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہے، اس اقتباس سے یہ متعین ہوجاتا ہے کہ نویں صدی ہجری سے بہت پہلے سے مسلمانوں میں یہ روایت چلی آتی تھی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ حضرت آدم کے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام اجودھیا میں آرام فرماتے ہیں سکندر لودی نے ان کی ... کو پختہ کرا دیا تھا۔ بعد میں کسی شخص نے کچی چہار دیواری کے دروازے پہ کتبہ نصب کرا دیا ہے کہ

سیدنا حضرت شیث

پیغمبر

علیہ السلام

[illegible]

اس جگہ سے مسلمانوں کو جو ایمانی اور روحانی تعلق ہوسکتا تھا ملک کے طول وعرض میں کسی دوسرے مقام سے نہیں ہوسکتا تھا یہ واقعہ ہے کہ بیشتر اکابر اولیا نے اس طرف کا سفر کیا ہے اور بعض نے یہاں سکونت بھی اختیار کی ہے۔ حضرت نصیر الدین محمود اودھی معروف بہ چراغ دہلی کی اوایل عمری میں یہاں «مزارہا» موجود تھے اور وہ حضرت نماز فجر کے بعد کسی مزار پر پہنچ کر «مشغول» ہوجاتے تھے۔ وہ مزار ظاہر ہے کہ روحانی اعتبار سے معمولی درجے کے لوگوں کے نہیں تھے۔ حضرت نصیر الدین دہلی کے قیام کے زمانے میں ان مزاروں کو یاد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ :

«این زمان مزارہا وا ستان نمانده است » (خیر المجالس)

اس قدیم زمانے میں اودھ کے علاقے میں مسلمانوں کی بہت اچھی آبادی تھی۔ «مسجد جمعہ اودھ» کا ذکر خیر المجالس میں آیا ہے۔ اس خطۂ اودھ کے ایک (مسلمان) دیوانہ کی حکایت بھی منقول ہے کہ جو ایک (مسلمان) بره پکانے والے کی دوکان پر جاتا تھا۔

«بره پز بره در کراہی می انداخت ، او ہمچنان گرم از کراہی می کشید ، می خورد » (خیر المجالس ص ٢٢٦)

خود حضرت نصیر الدین کے والد اس علاقے میں پشمینہ کی تجارت کرتے تھے۔ ان تمام واقعات سے یہ بات ظاہر ہے کہ اودھ میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے بڑی تعداد میں اقامت اختیار کرلی تھی بلکہ وہاں مسلمان مسافر بھی خاصی تعداد میں آتے جاتے تھے چنانچہ ایسی دوکانیں موجود تھیں جہاں کھانے کی چیزیں بکتی تھیں۔

دہلی کو مسلمانوں نے فتح کرلیا تھا ، سلطنت کی بنیاد قایم کرلی تھی ، اس کے باوجود وہاں پر انہوں نے تاہل کی زندگی غالباً چھٹی صدی ہجری تک بسر کرنی شروع نہیں کی تھی۔ «اخبار الاخیار» میں شیخ حمید الدین صوفی ناگوری کا یہ قول موجود ہے کہ ۔

«اول مولودیکہ بعد از فتح دہلی در خانۂ مسلمانان آمد ، منم »

(مقالات شیرانی ١ ص ١٣٥)

بچے کا پیدا ہونا اقامتی زندگی کے بسر کیے جانے پر دلالت نہیں کرتا لیکن بچوں کا نہ ہونا اقامت کے نہ ہونے کی دلیل ضرور ہوسکتا ہے ۔ شیخ ناگوری حضرت گنج شکر کے معاصر تھے اور انہوں نے ۶۷۳ ھ مطابق ۷۵-۱۲۷۴ع میں وفات پائی تھی۔ دہلی اور آس پاس کے علاقوں کی بولی سے مسلمانوں کے دلچسپی لینے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہے ۔

پروفیسر سید حسن عسکری کہ جن کا ہندوستانی زبانوں میں مسلمانوں کی قدیم تصانیف کا مطالعہ غیر معمولی ہے فرماتے ہیں کہ :

« ملک محمد جائسی کی پدماوت ، اکھراوٹ ، آخری کلام ، مہری نامہ وغیرہ ، قطبن کی مرگاوتی ، منجھن کی مدھومالتی ، نور محمد کی اندراوتی ، عثمان کی چتراولی سادھن کی مینا مالن کی کہانی ، نجش خاں کی بیوگ ساگر خالص اودھی زبان میں ہیں ۔ مجھے قدیم برج بھاشا ، راجستھانی ، بہاری وغیرہ زبانوں میں کسی مسلمان مصنف کی کوئی تصنیف نہیں ملی » (معاصر ۴ ص ۸۷)

اس طرح یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے اقامت اختیار کرنے کے بعد جس بولی کو اپنا لیا تھا وہ پوربی (اودھی) تھی ۔ یہ بولی ہندوستان کے طول وعرض میں سندھ سے بنگال تک اور دہلی سے دکن تک تمام علاقوں کے مسلمانوں میں جانی ، سمجھی جاتی تھی اور اس لحاظ سے اسے مسلم حلقوں کی ملک گیر زبان کا درجہ حاصل ہوگیا تھا ۔ اسی زبان کو اپنا لینے کے بعد مسلمانوں نے « ہندی » کا نام دیا البتہ وہ مسلمان جن کی اصل زبان فارسی تھی اور جن کے یہاں اس مقامی زبان سے غیریت کا احساس باقی تھا اسے تادیر « ہندوی » یعنی ہندوؤں کی زبان کہتے رہے ۔

مسلمانوں کے عقاید ، مقاصد اور لسانی مزاج میں یکسانیت بھی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ ہندوستان کی متعدد اور مختلف بولیوں میں سے کسی ایک بولی کو اختیار کرلیں ۔ حافظ محمود خاں شیرانی بھی اس بات میں ہمارے ہم خیال رہے ہیں ۔ فرماتے ہیں

« اگرچہ یہ (مسلمان ہندی کے) مصنف ہندوستان کے مختلف صوبوں سے علاقہ

رکھتے ہیں جہاں مختلف بولیاں اور بھاشائیں مروج ہیں ، کوئی بنگالے کا باشندہ ہے ، کوئی مالوے کا کوئی دہلی کا ہے تو کوئی کڑی کا اور ان میں سے ہر ایک مصنف کا اپنے اپنے وطن کی زبان سے واقف ہونا بھی لازمی ہے مگر دیکھا جاتا ہے کہ ہندی الفاظ لکھتے وقت وہ مقامی زبانوں سے قطع نظر کر کے صرف اس خاص زبان کے الفاظ درج کرتے ہیں جو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ یہ ذخیرۂ الفاظ ان کتابوں میں عام ہے ۔ » (مقالات شیرانی ۱ ص ۱۰۳)

اس مخصوص اور متعین بولی کو ملک گیر سطح پر مسلمانوں کے اختیار کرلینے کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان صوفیا اور اولیا سندھ سے بنگال اور دہلی سے دکن تک جہاں بھی گئے اسی بولی کو بولتے ہوئے گئے اور اسی کے واسطے سے وہ مقامی باشندوں سے رابطہ قایم کرنے میں کامیاب ہوتے رہے اس بولی کو سیکھنے کے لیے بالخصوص اودھ کے علاقے میں جانے کی ضرورت نہیں رہ گئی پروفیسر سید حسن عسکری نے مسلمانوں کی وحدت لسانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

« معدن الاسرار میں حضرت جلال بخاری علیہ الرحمۃ کے ایک جوابی فقرہ کو یہ لکھکر کہ الحق راست گفتہ یوں نقل کیا ہے کھندا ہے پھندا کہاں

ناقل (عبـــدالله شطـاری) کبھی اُچہ کیا دہلی تک بھی نہیں گئے اور منقول عنہ (سید جلال مخدوم جہانیاں) نے کبھی مشرقی ہند میں قدم رنجہ نہیں فرمایا لیکن ان دور افتادہ بزرگوں کی زبان پر جن کے مقاصد ، عقاید واعمال میں وحدت ویکسانی تھی کیا صاف اور نکھرا ہندوستانی یا اردو کا جملہ زیب دیتا ہے ۔ » (معاصر ۴ ص ۸۸)

یہ خیال کہ مسلمانوں نے دہلی اور آس پاس کی بول چال کو اختیار کیا تھا نہ صرف اس وجہ سے کہ اس کے لیے کسی نوع کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے صحیح نہیں ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی لایعنی ہے کہ دارالسلطنت میں ان کی فوجی چھاونی تھی اور فوجی چھاونی میں غیر کے گذر کے مواقع نہیں ہوا کرتے ۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کی حیثیت حاکموں کی تھی ، وہاں وہ کثرت میں تھے اور غالب تھے ۔ محکوموں کی بولی کو اختیار کرنے کی انہیں ضرورت نہیں تھی نوکروں چاکروں سے جو

بات چیت ہوتی ہوگی اس کو بہت زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں (صاحبـان انگریز پچھلی صدی میں «ہم حاے مکشـا» ہوتے رہے مگر اس کو نہ ان کی زبان نے اپنایا اور نہ زبان اردو ہی میں اس کے سبب تبدیلی کے کوئی آثار پیدا ہوئے) برابری کی سطح پر اس طرح کی چھاونی میں زبانوں کا کوئی لین دین نہیں ہوا۔ اس قسم کی ضرورت تو صرف وہیں پیش آسکتی تھی جہاں مسلمانوں نے سکونت اختیار کر کے اپنے عقاید اور خیالوں کو مقامی باشندوں میں پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ حافظ محمود خان شیرانی نے بھی اعتراف کیا ہے :

«اردو زبان لشکر اور دربار کے مقابلے میں زیادہ تر خانقاہ سے تعلق رکھتی اور شاعروں سے بہت پہلے مشایخ اس کو ادبی شکل دیتے ہیں۔» (مقالات ۱ ص ۱۵۸)
مولوی عبدالحق مرحوم نے شارح اکھروتی کا جو قول نقل کیا ہے اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہ اس طرح ہے :

«وگمان مکنند کہ ہیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردہ، زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجۂ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس اللہ سرہ بدیں زبان سخن فرمودہ، بعد ازاں حضرت خواجہ گنج شکر قدس اللہ سرہ در زبان ہندی وپنجابی بعضے از اشعار نظم فرمودہ، چنانکہ در مردم مشہور اند۔۔ وہمچناں ہر یکے از اولیاء بدیں لسان تکلم می فرمودند تاکہ عہد خلافت ایشان باحقق مدقق (ملک محمـد جایسی) رسید و وے دریں زبان بسیارے از مضمات از رسائل ومطولات تصنیف فرمودہ۔» (ابتدائی نشو ونما ص ۸ تا ص ۹)
حضرت خواجۂ بزرگ کا سال ولادت اور سال وفات ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ع

بتولیدش امام متقی خواں وصالش بیر اکبـر معانی

۵۳۷ ۶۳۳

آپ کی شخصیت کسی بھی طرح محتاج تعارف نہیں ہے۔ یہاں اتنا کہدینا کافی ہے کہ اصفہان میں پیدا ہوئے تھے، خراسان میں تربیت پائی، مختلف مقاموں سے ہوتے ہوئے اجمیر پہنچے اس شہر کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی گئی ہے۔

«در ایام سلف آجا نامی راجۂ راجگان ہند بود کہ تا حدود غزنین مملکت در قبضۂ

اقتدار او بود وایں شہر را بنام خود آباد ساخت ومیر یعنی کوہ وآجا بمعنی آفتاب بزبان ہند است ودراصل بابتدا نام ایں شہر آج میر یا آجامیر بود، بعـــد ازاں بکثرت استعمال باسم اجمیر مشہور گردید » (اخبار الاخیار بحوالہ خزینۃ الاصفیا ص ۲۶۶)

«تاج المآثر» نامی ایک قـــدیم قلمی کتاب کے حوالے سے مولانا ابو الحسنات ندوی نے لکھا ہے کہ

« (فتح اجمیر ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ع کے بعد) شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر میں متعدد مدرسے قائم کیے تھے » (اسلامی درسگاہیں ص ۲۰)

ان مدرسوں میں کن کن علاقوں کے استاد اور شاگرد جمع کیے تھے اِس بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اگر وہاں محض اسلامیات کی تعلیم ہوتی ہو تو بھی ان استادوں اور شاگردوں کا مقامی بولی سے غیر متعلق کیا جانا ممکن نہیں تھا، چنانچہ اس بات میں شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اُس قدیم زمانے میں بھی مسلمان زبان ہندی سے کم و بیش واقف ہو چلے تھے. حضرت خواجۂ بزرگ کا جو اُس زمانے میں بھی مسلمانوں کے امام اور پیشوا کا درجہ رکھتے تھے اِس زبان میں کبھی کبھی بات کر لینا مستبعد نہیں ہے. ان کی زبان کا کوئی نمونہ اب محفوظ نہیں کیا گیا ہے. البتہ مفتی غلام ســــرور ناقل ہیں کہ جس وقت «رام دیو» نامی مہنت نے حاضر ہوکر «زبان تصدیق کلمۂ اسلام» کھولی تو «خواجـہ اور اشادی دیو نام نہاد وبہ تکمیل رسانید وشادی دیو درہندی بمعنی فرحت دہندہ رسند » (خزینۃ الاصفیا ص ۲۶۰)

اس مقام پر دوامور خاص طور سے توجہ طلب ہیں.

«رام دیو» نام بجائے خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اجمیر کا وہ مہنت اور اس کے والدین رامچندرجی کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے. یہ عقیدت اس بات کی غماز ہے کہ اودھ نگری کی کتھا اور وہاں کی زبان بھی اجمیر کے علاقے تک پہنچ چکی تھی اور وہاں کے ہندو اس سے اپنی وابستگی پر فخر محسوس کرتے تھے

خواجہ بزرگ نے اس شخص کو جو نام دیا اس کے معنی اور مفہوم سے

وہ واقف تھے لفظ «دیو» زبان ہندی (پوربی یا اودھی) میں «دینا» مصدر سے صیغۂ امر ہے اور اسم فاعل بنانے کے لیے بطور لاحقہ کے آیا ہے پنجاب، دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں اس لفظ کو یائے مجہول کے ساتھ کوئی نہیں بولتا

حضرت خواجۂ بزرگ کے بعد مختلف اکابر صوفیا کے اقوال اور ملفوظات بھی اس خیال کے مؤید ہیں کہ وہ حضرات اس زبان ہندی سے واقف تھے اور اس میں بات چیت کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے خیرالمجالس کی ایک حکایت کا ذکر کرکے اس قسم کے تمام اقوال کو مشتبہ قرار دیدیا ہے فرماتی ہیں : خیر المجالس کی سند پر ماننا پڑےگا کہ موسا علیہ السلام کے وقت کے بت پرستوں کی یہی زبان تھی۔ اس کتاب میں ہے

فرمودند کہ در عہد موسیٰ علیہ السلام بت پرستے بود، روزے اوراتپ آمد، بر سرپائے بت سر بہاد وگفت

تو میرا گسائیں تو میرا کرتار، مجھ اس تاپ تھیں چھوڑا
ہیچ جوابے نیامد، گفت، تو کرتار نہیں۔

جس نیک نیت بزرگوں نے زبان ہندی کو زمان و مکان دونوں کے لحاظ سے اس قدر دور پہنچا دیا ہے ان کے فیض سے ہندوستان کے ہر صوفی کی زبان سے ایک دو ہندی جملوں کا ادا ہوجانا کیا بڑی بات ہے۔ (دکنی کی ابتدا ص ۱۸)

خیرالمجالس کی عبادت ڈاکٹر آمنہ خاتون نے اختصار کے ساتھ نقل کی ہے۔ انہوں نے اس حکایت سے جو نتیجہ نکالا ہے ان کے سوا شاید دوسرے نے نہ نکالا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جملوں کا قایل وہ بت پرست نہیں ہے بلکہ وہ ہے جس کے لیے «فرمودند» آیا ہے۔ یہ بات مرتب خیرالمجالس کے ان لفظوں سے بھی ظاہر ہے کہ :

«ایں لفظ بزبان ہندی فرمودند، ہمچناں نوشتہ شد» (خیر المجالس ص ۲۲۳)
صاحب خیرالمجالس کے خیال میں اگر وہ بت پرست ہندی بولتا ہوتا تو اسی حکایت میں اس سے متعلق باقی جملے بھی اسی زبان میں ہوتے، فارسی میں نہ ہوتے۔

ان کلمات کو زبان ہندی میں ادا کرنے سے حضرت نصیر الدین اودھی کو

یہ مقصود تھا کہ اس بت پرست کی بات بہتر طور سے واضح ہو جائے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ صوفیا کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ حضرت آدم نے اسی زبان میں تکلم فرمایا تھا چنانچہ حضرت موسیٰ کے عہد میں بھی ہندوستان کے بت پرست کا اسی زبان میں گفتگو کرنا کسی طرح خلاف قیاس نہیں کہا جاسکتا اس حکایت میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ وہ بت پرست حضرت موسیٰ کا ہموطن بھی تھا اسی طرح یہ دعوا بھی نہیں کیا گیا ہے کہ اس بت پرست کی زبان "ہندی" تھی

اقتباس بالا میں جو ہندی کے جملے آئے ہیں ان میں تو، میرا، اس وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک زبان ترقی کر کے خاصی حد تک صاف ہو چکی تھی مجہ (= مجھ) بجائے مجھے یا مجھکو اور تھیں بمعنی سے البتہ ان جملوں کی قدامت پر دلالت کرتے ہیں یہ جملے آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول کی زبان ہندی کا نمونہ ہیں

حضرت خواجہ بزرگ اجمیری کے بعد حضرت شیخ فرید الحق والدین اجودھنی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے وہ نسباً فاروقی تھے اور ۵۸۵ھ مطابق ۱۱۸۹ع میں ملتان کے مضافات میں قصبہ کھوتوال میں پیدا ہوئے "فرید الاولیا پیر" سے
۵۸۵
سال ولادت کے عدد برآمد ہوتے ہیں شیخ فرید حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کے مرید ہوئے اور گنج شکر کے خطاب سے سرفراز ہوئے سال وفات میں اختلاف ہے۔ اخبار الاخیار اور سفینۃ الاولیا میں ہے کہ ۵ محرم ۶۶۴ھ مطابق اکتوبر ۱۲۶۵ع کو بروز سہ شنبہ وفات پائی۔

بندۂ حق فرید قطب الہند
۶۶۴

مصرع تاریخ ہوا۔ حافظ محمود خان شیرانی نے "سیر الاولیا" کے ۱۳۰۲ھ کے مطبوعہ نسخے سے ان سے منسوب ایک جملہ اس طرح نقل کیا ہے۔

"پونیوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے" (مقالات شیرانی ۱ ص ۱۳۹)

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی کتاب سے شیرانی نے جب "پنجاب میں اردو" میں نقل

کیا تو اس جملے کے الفاظ یہ ہو گیے۔

«پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے» (ص۲۵۶)

شیرانی جیسا محتاط شخص ایک ہی کتاب سے ایک جملہ نقل کرنے اور اس میں بھی فرق ہوجائے تو خیال کرنا چاہیے کہ کئی سو سال تک نقل در نقل ہونے کے بعد اس جملے کی صورت کس حد تک بدل گئی ہوگی جملے کی موجودہ کسی ایک صورت پر اعتماد کرکے حضرت گنج شکر کی زبان کے بارے میں کوئی حکم لگانا مناسب نہیں ہے۔

حافظ محمود خان شیرانی نے پچھلی صدی کی مطبوعہ کتابوں سے اور بھی ایسے کچھ جملے نقل کیے ہیں جو حضرت گنج شکر سے منسوب ہیں ان کی صحت کے بارے میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا ایک جگہ شیرانی نے لکھا ہے

«شیخ فریدالدین اکثر اوقات لوگوں کو «بھیا» کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے۔» (مقالات شیرانی اص۱۴۰)

اگر اس پر اعتماد کیا جاسکے تو کہا جائیگا کہ آپ کا خطاب کرنے کا طریقہ اہل پورب والا تھا لفظ «بھیا» میں «یا» کا لاحقہ پوربی بولی کے قاعدہ کے مطابق ہے جہاں کبھی تصغیر کے لیے اور کبھی اظہار تعلق کی خاطر اس کا اضافہ کرلیتے ہیں جیسے

بھیا (بھی+یا)، درریا (درری+یا)، لڑکیا (لڑکی+یا)

ڈاکٹر آمنہ خاتون نے حضرت گنج شکر سے منسوب فقروں کے بارے میں اعتراضاً فرمایا ہے کہ «ان کی بنا پر کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کے جملوں یا شعروں کے بولنے والے غیر مسلم نہیں ہوسکتے» (دکنی کی ابتدا ص ۱۷)

یہ بات شروع میں ہی کہی جاچکی ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی بولیوں میں سے ایک بھی پوربی ہندی کو اختیار کیا تھا، ظاہر ہے کہ اس سرزمین پر بسنے والے ہندو (غیر مسلم) اسی زبان کو بولتے تھے مسلمان صوفیا کے اقوال تو صرف اس بات کے ثبوت کے لیے پیش کیے جارہے ہیں کہ انھوں نے بھی اس زبان کو اختیار کرلیا تھا ہندوؤں میں یہ غیر مقتدر، پسماندہ اور غریب عوام کی زبان تھی

اور اس کے تحریری نمونے دستیاب نہیں ہیں۔ مسلمان صوفیا نے اس زبان میں جو گفتگو کی اس میں سے کچھ کچھ الفاظ، فقرے اور جملے ان کے ملفوظات وغیرہ میں قلمبند ہوگئے ہیں اور وہی اس زبان کے نقوش ہیں جن کی مدد سے اس عہد کی بول چال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ فقرے اور جملے فارسی تحریروں کے ساتھ قلمبند کیے گیے ہیں اس لیے ان کے واسطے بھی فارسی خط ہی استعمال کیا گیا، رفتہ رفتہ یہی خط پوربی (ہندی) کے لیے مخصوص ہوگیا اور اس زبان کی باقاعدہ اور باضابطہ تصانیف بھی اس خط میں محفوظ کی گئیں

خیر المجالس میں علی مولا بدایونی کا ذکر آیا ہے ایک حکایت میں مذکور ہے کہ

« علی مولا چوں دید، آغاز کرد بہ زبان ہندوی۔ ارے مولانا یہ بداہوسی یعنی اے مولانا ایں مرد بزرگ خواہد شد، بعد ازاں به زبان ہندوی گفتند

جو منڈاسا باندھی سو پانی پسری

یعنی انکہ دستار بر سر بندد او در پائے کسے افتد » (ص ۱۹۱)

دوسرے قول میں « باندھی » اور « پسری » پوربی کے قاعدے کے مطابق مستقبل کے صیغے ہیں۔ پنجاب، دہلی، بدایوں اور آس پاس کے علاقوں کی زبان میں اس طور پر نہیں بولتے اسی طرح « پانی » کا معاملہ ہے کہ یہ « پائے » کی جمع ہے پوربی میں جمع بنانے کے لیے « ین » کا اضافہ کیا جاتا ہے، چنانچہ پانی، پانوں ۔ بات، باتی وغیرہ

اس جملہ کے قایل ہی کا وہ پہلا جملہ بھی ہے کہ « یہ بداہوسی » ۔ اس میں حرف « سی » نے بعض لوگوں کو الجھن میں مبتلا کردیا ہے کیونکہ انھوں نے اس کو جدید پنجابی کے قاعدے کے مطابق مستقبل کی علامت سمجھا ہے حقیقت یہ ہے کہ پوربی (ہندی) میں حرف « سی » فعل کی چاروں حالتوں میں یعنی ماضی، حال، مستقبل اور امر میں استعمال ہوتا رہا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیں قاعدۂ ہندی ریختہ حاشیہ ص ۱۳۶ تا ص ۱۳۹)

پوربی (ہندی) ہندوستان کے پسماندہ عوام کی زبان تھی، اس میں سختی اور کرختگی

نام کے لیے بھی نہیں تھی۔ اس میں اس حد تک شیرینی اور حلاوت تھی کہ اس کے ہر بول میں نغمہ کا اثر معلوم ہوتا تھا ، نتیجہ یہ تھا کہ یہ زبان شروع سے گانے کے لیے نہایت مناسب خیال کی گئی تھی مسلمانوں نے بھی اس کے اس وصف سے فایدہ اٹھایا بحر المعانی کے ایک مکتوب مورخہ ۲۶ ۔ ذی الحجہ سن ۸۲۴ ھ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے اپنے مرشد حضرت خواجہ بزرگ اجمیری (متوفی سن ۶۳۳ ھ) سے «ابیات عربی و فارسی یا ہندی» کے استعمال کی اجازت حاصل کرلی تھی (معاصر ۴ ص ۷۹) «ابیاتِ ہندی» کے گائے جانے سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ اس زبان میں ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) سے بھی پہلے شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا

قاضی حمید الدین ناگوری کے ایک مرید شیخ احمد نہروانی (متوفی سن ۶۶۱ ھ مطابق سن ۱۲۶۳ ع) ذات کے جلاہے تھے ۔ ان کے بارے میں «فواید الفواد» میں مذکور ہے کہ

« چنیں گویند کہ او نعمت از فقیر مادھو یافتہ بود واین فقیر مادھو امامِ مسجد جامع اجمیر بود روزے شیخ احمد نہروانی ہندوی می‌گفت در آوانِ جوانی آوازِ خوب داشت ۔ ہندویہا خوب گفتے ۔ چوں فقیر مادھو شنید ، گفت ، چنیں آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرودِ ہندی خرچ کنی ، فقیر مادھو فرمود کہ ، قرآں یاد کن ، شیخ احمد قرآں یاد گرفت » (مقالات شیرانی ۱ ص ۲۹۲)

شیخ احمد نہروانی نے حضرت نظام الدین اولیا کی محفلوں میں بھی شرکت کی ہے

سلطان المشایخ حضرت نظام الدین کے ذکر میں صاحب کتاب چشتیہ نے لکھا ہے کہ ۔

« سلطان الاولیا را پردۂ پوربی بغایت خوش آمدے میفرمودند کہ ما پیر شدیم و پوربی پیر نہ شد ۔ »

زبان ہندی (پوربی) میں گانے کا ایک خاص انداز متعین ہوچکا تھا اسی کو پوربی راگ یا پردۂ پوربی کہتے تھے ۔ اس راگ میں عموماً پوربی بولی کے گیت (شعر) گائے جاتے تھے جن کو سلطان المشایخ اور ان کی محفل کے شریک نہ صرف سمجھتے

تھے بلکہ بغایت پسند بھی کرتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خود بھی اس زبان
میں "دوہرے" کہہ لیتے تھے اس زبان اور اس زبان کے مخصوص انداز کے
گیتوں سے سلطان المشایخ کی دلچسپی نے اس زمانے کے مسلمانوں کے دلوں میں
اس کے لیے پسندیدگی اور احترام کی جو جگہ بنا دی ہوگی اس کا قیاس کیا جانا
چاہیے

بزرگوں کی محفلوں میں قوالیوں میں گائے جانے کے لیے ایک سے زاید شعروں
پر مشتمل مربوط نظمیں خواہ وہ کتنی ہی مختصر ہوتی ہوں، لکھی جانے لگی تھیں۔
اس طرح پوربی (ہندی) میں شاعری کی ترقی کے لیے تحریک ہوئی اور بہت جلد
"چندائن" جیسی مربوط اور طویل نظم وجود میں آئی جس نے اس حد تک قبولیت
حاصل کی کہ اس کے شعر دہلی میں ہر سر منبر پڑھے گئے

دکن کا علاقہ پورب دیس سے اگرچہ دور تھا، دونوں کے مابین معاشرتی
ہی نہیں سیاسی روابط بھی قایم تھے ساتویں صدی ہجری تک وہاں پر یادو خاندان
کی حکومت قایم تھی اس خاندان کے راجاؤں کے ناموں میں لفظ "دیو" شامل
ہوتا تھا چنانچہ ان کا صدر مقام دیوگیری کے نام سے موسوم تھا لفظ گر یا گیری
پہاڑی کے معنی میں آتا ہے اور بہار میں بھی "راجگیر" کی پہاڑیوں کے نام میں
یہ لفظ بطور لاحقہ کے موجود ہے برار اور مضافات تک کا علاقہ یادو خاندان
کے زیر نگیں تھا اس تمام علاقے میں اس خاندان کے اثر سے زبان ہندی (پوربی)
ہی نہیں پہنچی تھی بلکہ پورب کی معاشرت کے اثرات بھی وہاں عام ہو رہے تھے۔
دکن اور پورب کے مابین تجارتی رابطہ بھی قایم تھا غرض یہ کہ دونوں علاقوں
میں مختلف النوع تعلقات تھے

محمد تغلق نے دکن کے حملوں کے زمانے میں دیوگیری کو دیکھا تھا۔ وہاں
کی آرایش و زیبایش سے وہ اتنا متاثر ہوا تھا کہ کئی برس تک اس کی یاد کو
دل سے بھلا نہ سکا بادشاہ ہونے کے بعد شروع کے کچھ سال تو سلطنت کو
مستحکم کرنے میں صرف ہوئے اس کے بعد جب ذرا سکون ہوا تو پھر دیوگیری
کی یاد آئی اور وہ ساری دلی کو ساتھ لیکر وہاں کے لیے روانہ ہوگیا اس شہر کو

دولت آباد کا نام دیکر اس نے اپنا دارالسلطنت بنا لیا

مورخین نے دارالسلطنت کی اس تبدیلی کو محمد تغلق کی دیوانگی سے تعبیر کیا ہے لیکن انھوں نے دیوگیری کی ان خوبیوں پر نظر نہیں کی جنھوں نے بادشاہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور جن کے مقابلے میں اعلیٰ ہے کہ دہلی کی رونقیں ہیچ تھیں ۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس قدیم زمانے میں دکن کے علاقوں میں مستعمل بعض غیر دکنی لفظوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں ۔

عربی ، فارسی الفاظ منصب ، تعلقہ ، تحصیل ، تحصیلدار ، درخواست ، بقلم
ہندوی الفاظ ۔ تنک (تلک ، تک) ، لوہی

اس زمانے میں دکن کے بعض صوفی بزرگوں کے نام بھی دونوں علاقوں ، پورب اور دکن کے مابین رابطہ کی غماری کرتے ہیں مثلاً

صدرالدین بولکھی ، کمال الدین کھڑک پھوڑ ، پیر کالے ، پیر میٹھے ، پیر جھما زبان کا پھیلاو یک طرفہ نہیں تھا ۔ دکن کی بولی کے اثرات بھی کم و بیش پورب دیس کی طرف پہنچ رہے تھے شہر بہرائچ کا نام (بھڑائیچ - بھڑائی + چ یعنی خاص لڑائی) خاص طور سے توجہ کے قابل ہے جس میں تاکیدی " چ " جو دکنی بولیوں کی خصوصی علامت سمجھی گئی ہے ، موجود ہے ۔

مسلمانوں نے زبان ہندی (پوربی) کو پورے اہتمام کے ساتھ اختیار کیا تھا ۔ انھوں نے مقامی لفظوں کو یہیں کے تلفظ کے ساتھ برتنے کا التزام کیا ہے ۔ جب بہ ضرورت عربی ، فارسی کے اسما اور مصطلحات کا استعمال کیا تو اس میں بھی مقامی آوازوں اور لب و لہجہ کے تقاضوں کا خیال رکھا ۔ ہندی (پوربی) کی قدیم ترین تصنیف چندایں میں فیروز کو پھیروج اور سلطان کو سرتان نظم کیا گیا ہے ۔ پورب دیس میں تلفظ اور املا کی یہ صورت تادیر باقی رہی مگھر والے کبیر نے بھی ایک شعر میں کہا ہے ع

سو سرتاں جو دوی سرتاہے
باہر جاتا بھیتر آہے

اس میں لفظ سلطان کے مروجہ تلفظ سے فایدہ اٹھا کر اسے بطور ذو معنیین نظم کیا ہے اور شعر میں ایہام کا لطف پیدا کر دیا ہے۔

یہ متعین کرنا کہ ہندی (پوربی) میں عربی، فارسی کی کون سی آواز کب داخل ہوئی، آسان نہیں ہے البتہ اتنی بات خیال میں آتی ہے کہ دہلی والے چونکہ حاکم و غالب تھے، عربی، فارسی کے مقابلے میں ہندی کو ہیچ پوچ سمجھتے رہے۔ وہ ہمیشہ ش، ق کی درستی پر زور دیتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بعض وقت مقامی لفظوں کو عربی کی دقیق آوازوں کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔ خواجہ امیر خسرو نے جو ہندی کو ہندوی کہتے رہے اپنی مثنوی «قران السعدین» میں لفظ «اودھ» کو «عَوَص» نظم کیا ہے ع

لشکرِ مشرق زعَوَض تا بہ گنگ　　　چہرہ دل و خیرہ کش و تیر جنگ

(بحوالہ مقالات شیرانی ۱ ص ۶۳)

یہ صورتِ حال دہلی میں بہت بعد تک رہی ہے چنانچہ ابوالفضل کی آئین اکبری میں بعض لفظوں کا تلفظ توجہ طلب ہے مثلاً۔

املی (املی)، سیب (سیم)　　　(بحوالہ مقالات شیرانی ۲ ص ۱۷، ۱۸)

مشہور ہندوستانی پھل آم کا قدیمی ہندوستانی تلفظ «انب» اور «آنب» ہے۔ حضرت نصیرالدین محمود اودھی نے اس لفظ سے فارسی کے قاعدے کے مطابق ایک نیا لفظ «انبستان» وضع کیا تھا۔ دلی والوں نے اسی «انب» کو بدلکر «انبہ» اور اسی کو «انبج» بنا لیا اس تبدیلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی میں ہندی کی طرف میلان کمتر تھا البتہ ہندی لفظوں کو فارسی، عربی کے سانچے میں ڈھال لینے کا رجحان زیادہ پایا جاتا تھا

ہندی (پوربی) کی آوازوں میں کئی ایسی ہیں جن میں «ہ» کی آواز حرف ماقبل کی آواز کے ساتھ مخلوط ہوجاتی ہے، ایسی آوازوں کے لیے «ہائیہ آواز»

کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے ان میں سے چند جدید ہندی (جو دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے) میں بھی پائی جاتی ہیں یعنی

بھ (भ)، پھ (फ)، تھ (थ)، ٹھ (ठ)، جھ (झ)
چھ (छ)، دھ (ध)، کھ (ख)، گھ (घ)

لیکن چند آوازوں کے اظہار کے لیے اس جدید زبان میں کوئی صورت متعین نہیں ہے۔ قدیم ہندی (پوربی) میں ان کا وجود مسلم ہے فارسی خط میں تمام ہائیہ آوازوں کو حرف "ہ" کے اضافے کے ساتھ لکھنے کا طریقہ رہا ہے، انیسویں صدی عیسوی میں ایسے مقام پر ہائے دو چشمی کا طریقہ مقرر ہوگیا چنانچہ اس کے برخلاف لکھنے پر اعتراض کرتے ہوئے شیخ محمد ابراہیم ذوق نے بھی کہا تھا ع

ہائے رے حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی		لکھتے ہیں دو چشمی سے کتابت والے

اس اصول کے مطابق قدیم ہندی (پوربی) کی زاید ہائیہ آوازیں یہ ہوئیں

رھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ

قدیم ہندی (پوربی) میں "ڑ" کی آواز بھی بہت قدیم ہے چنانچہ ناصرالدین محمد تغلق کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے "کھڑا کھڑی" کہلوایا تھا۔ شیرانی نے میاں مصطفا گجراتی (متوفی ۹۸۴ھ مطابق ۱۵۷۶ع) کے ایک مکتوب کا ذکر کیا ہے مرتب مقالات شیرانی کا اس کے بارے میں کہنا ہیں کہ :

"اصل تحریر میں ڑ کی شکل پر ملتی ہے اس طرح ڈ کو د[1] اور ٹ، ٹھ کو بالترتیب ٹ[2]، ٹھ[3] یعنی چار نقطوں کے ساتھ لکھا گیا ہے۔" (مقالات شیرانی، ۲ حاشیہ ۷۹)

ٹ، ڈ، ڑ کی آوازیں عربی، فارسی میں نہیں ہیں اسلئے شروع زمانے میں ان تینوں کے اظہار کے لیے عربی فارسی کے حرف ت، د، ر استعمال کیے گیے اور امتیاز کی خاطر ان کو تائے ہندی، دال ہندی، رائے ہندی کہا گیا ان ناموں میں لفظ ہندی قدیمی زبان پوربی سے تعلق کے اظہار کے لیے لایا گیا تھا اس کا تعلق جدید ہندی سے جو سنسکرت سے ماخوذ ہے کچھ نہیں ہے سنسکرت اور جدید ہندی میں اب تک بھی ڑ کا وجود ثابت نہیں ہے اٹھارویں صدی تک ان زبانوں میں اس آواز کے

---

۱ ڈ۔ د کے نیچے تین نقطے تصور کئے جائیں
۲-۳ ٹ کے تین نقطوں کے بجائے چار نقطے تصور کئے جائیں (مدیر)

اظہار کی طرف توجہ بھی نہیں معلوم ہوتی ہے (ڈ) کے نیچے ایک نقطہ لگا کر (ڑ) لکھنے کا طریقہ نکالا گیا لیکن رواج حاصل نہیں ہوسکا یہ (ڑ) کی آواز بھی رھ لھ مھ وغیرہ آوازوں کی طرح قدیم ہندی (پوربی) کی مخصوص آواز ہے جو عربی، فارسی سنسکرت اور جدید ہندی میں بھی نہیں ہے

سنسکرت اور جدید ہندی میں ش کے اظہار کے لیے دو صورتیں مقرر ہیں یعنی ، ष ، श

عربی ، فارسی میں بھی اس آواز کا وجود مسلم ہے قدیم ہندی (پوربی) میں یہ آواز نہیں ہے چنانچہ اس زبان میں دیش غلط ہے ، دیس صحیح ہے اس زبان میں ش کی آواز بہت بعد تک شامل نہیں ہوی تھی ظہیر الدین محمد بابر (متوفی ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۳۰ ع) نے بھی لکھا ہے

« اہل ہندوستان شین را سین تلفظ می کنند » (بحوالہ مقالات شیرانی ۲ ص ۳)

دلی والوں کے یہاں 'شین' کی آواز کا استعمال عام تھا، ظاہر ہے کہ بابر نے اہل ہندوستان سے اہل پورب ہی مراد لیے ہیں، جہاں یہ آواز مروج نہیں تھی اردو میں بھی جو اسی اہل پورب کی زبان ہندی پر مبنی ہے اب تک مقامی لفظوں میں شین پر سین کو ترجیح دی جاتی ہے البتہ عربی، فارسی اور اب[1] انگریزی لفظوں میں بھی شین کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔

جدید ہندی میں 'ب' اور 'و' کی آوازیں متبادل ہیں ، اس میں وشو اور بشو دونوں طرح درست ہیں ان آوازوں کی تبدیلی سے معنی میں بھی کوی فرق نہیں پڑتا قدیم ہندی (پوربی) میں جس کی ارتقا یافتہ صورت اردو ہے یہ دونوں مستقل اور غیر متبادل آوازیں (مصوتہ) ہیں ان کی تبدیلی سے لفظ کے معنی بھی بدل جاتے ہیں چنانچہ ذیل کے مصرعوں سے ظاہر ہے

---

۱ واضح رہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب بھی جو شین کی آواز کے ادا کرنے پر بخوبی قادر تھے انگریزی الفاظ پنشن اور انگلش کو ہمیشہ سین غیر منقوطہ کے ساتھ لکھنے کا التزام کرتے تھے

ع　　بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں

اور ع　　شوق سوں وار وار جاؤنگی

عربی اور فارسی میں بھی ب اور واو کی یہی حیثیت ہے وہاں بھی یہ دونوں مصوتے ہیں

فارسی میں ف اور پ کی آوازیں بعض وقت متبادل ہو جاتی ہیں لیکن اردو میں ایسا کبھی نہیں ہوتا چنانچہ برات (برتن) اور فرات (دریا) سے ظاہر ہے

ہندی (پوربی) میں نون کے ادا کرنے کی دو صورتیں ہیں فارسی خط ان دونوں کے الگ الگ اظہار سے عاجز تھا ۔ بعد میں حرف نون کی دو شکلیں مقرر کی گئیں اس طرح

نون بالاعلان - نون منقوطہ — ن

نون بالادغام - (نون غنہ) نون غیر منقوطہ — ں

ان دونوں کے حالت ترکیب میں لکھنے کے لیے ضابطہ بنانے کی شعوری کوشش شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد میں اٹھارویں صدی عیسوی کے اوایل میں کی گئی تھی لیکن اسے رواج حاصل نہیں ہو سکا

قدیم ہندی (پوربی) اور جدید ہندی (جو سنسکرت پر مبنی ہے) کی آوازوں پر نظر کریں تو بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں کا صوتی نظام مختلف ہے ۔ اول الذکر میں کئی آوازیں ہیں جو ہندی میں نہیں ہیں ظاہر ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کی « شیلی » یا ایک ہی قدیم زبان سے مستخرج کرنا صحیح نہیں ہو سکتا ۔ اردو قدیم ہندی (پوربی) کی ارتقا یافتہ صورت ہے اس کا مزاج ، اس کی صوتیات ، اس کی لفظیات کا مأخذ جدید ہندی سے الگ ہے اور یہ جدید ہندی سے مختلف ، منفرد اور ایک باضابطہ زبان ہے ۔

• •

سید قدرۃ اللہ فاطمی
اسلام آباد، پاکستان

ملفوظات حضرت شاہ عالم

مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، کا ایک بیش بہا مخطوطہ

صاحبِ تاریخِ صدرِ جہاں، فیض اللہ بنبانی (۸۵۷ھ - ۹۱۷ھ)[1] اور ان کے خاندان کے بارے میں معلومات کی تلاش کے دوران میں راقم الحروف کو زیرِ عنوان مخطوطے کے مطالعے کا موقع ملا۔ فیض اللہ بنبانی نے اپنے دادا حسام الدین بنبانی کے زیرِ سایہ تربیت پائی تھی اور ان سے اس قدر قریب تھے کہ ایک ہم عصر گراں قدر فقہی تصنیف میں انہیں «مولانا صدر الدین الحسام الدین بنبانی» اور «الامام العالم صدر بن حسام البنبانی» کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔[2] حسام الدین بنبانی حضرت شاہ عالم (۸۴۷ھ - ۸۸۰ھ) کے ہم عصر تھے اور بڑے جید فقیہ۔ مرآۃ احمدی میں شاہ عالم سے ان کے معارضے کی تفصیل سے جہاں شریعت اور طریقت کی باہمی آویزش کی ایک جھلک نظر آتی ہے،[3] وہاں زیرِ بحث مخطوطے کے مطالعے سے ان دونوں بزرگوں کے درمیان چند در چند روابط اور اربابِ شریعت و اصحابِ طریقت کے آپس کے اتحاد کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے، جس کی چند مثالیں درجِ ذیل ہیں۔

حضرت میاں مخدوم (۸۲۶ھ - ۸۹۰ھ) حسام الدین بنبانی کے عزیز شاگرد تھے[4] اور شاہ عالم کے «وزیرِ خاص و خلیفۂ با اختصاص» (اوراق ۴۸ ب، ۵۷ ب، ۶۰ الف،

---

۱ فیض اللہ بنبانی کی تاریخ ولادت و وفات کے بارے میں راقم الحروف نے اپنے زیرِ تحریر مقالہ «تاریخ صدر جہاں اس کے مصنف اور ان کا خاندان» میں تفصیلی بحث کی ہے۔

۲ خزانۃ الروایات از قاضی جکن، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، مخطوطہ نمبر ۱۷۳۶ اوراق ۱۶۰ (الف) و ۱۶۴ (ب) علی الترتیب۔ ایضاً، مخطوطہ مدرسہ محمدیہ لائبریری، جامع مسجد، بمبئی - نمبر ۱۰۳/۱۶/۳، اوراق ۱۰۳ (ب) و ۱۰۶ (الف) علی الترتیب۔

۳ مرآہ احمدی (گائیکواڑ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، بڑودہ) ۱۹۳۰ع، خاتمہ، ص ۹۸ - ۱۰۱

۴ ایضاً، ص ۴۷ - ۴۸

۸۲ الف، ۸۹ ب، ۱۶۸ ب، ۱۷۲ ب وغیرہ)۔[۵] حسام الدین سمانی کے ایک اور شاگرد تھے، سید یوسف، جنہیں حضرتِ شاہیہ سے خرقۂ خلافت ملا تھا (ورق ۸۰ ب) ان کے دل میں صاحب تصنیف ہونے کی امنگ تھی جسے بھانپتے ہوئے انہیں رسالے کی تالیف (مخطوطے میں تالیف کی بجائے "تلفیق" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے) کے لئے مفید مشورے دئے (ورق ۸۰ ب) اور جب رسالہ مکمل ہوگیا، تو اس کا ایک حصہ مصنف کی زبانی سنا جس کی نقل مخطوطے میں درج ہے (اوراق ۸۷ الف تا ۸۸ ب)۔

اللہ دیا شاعر چلنے، دیکھنے اور بولنے سے معذور تھے۔ شاہ عالم کی کرامت سے بالکل بھلے چنگے ہوگئے اظہار ممنونیت کے لئے انہوں نے ایک پُر اثر قصیدہ ارتجالاً شاہ عالم کی مدح میں پڑھا (اوراق ۴۹ ب تا ۵۰ الف) ایک اور موقع پر انہوں نے قصیدہ نذر گزرانا، جس کی پذیرائی کرتے ہوئے شاہ عالم نے مرصع چادر اپنے کندھے سے اتار کر ان کے سر پر اس ڈھنگ سے باندھی کہ ہر پیچ کے ساتھ زیر لب کچھ ارشاد فرماتے جاتے تھے (ورق ۵۹ ب) حضرت قطب عالم کے عرس کے موقع پر بھی انہوں نے ایک برمحل شعر شاہ عالم کی مدح میں پڑھا، جس کے بعد محفل سماع منعقد ہوئی (ورق ۱۶۸ ب) زیر نظر مخطوطے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہیہ کے یہ شاعر خاص مولانا حسام الدین سمانی کے خویش تھے، (ورق ۵۹ ب) یعنی فیض اللہ سمانی کے پھوپھا۔ لائق بھتیجے نے انہیں "مولانا منصور المعروف بہ اللہ دیا شاعر" کے نام سے بڑی محبت اور تکریم کے ساتھ یاد کیا ہے۔ سن ۹۰۰ھ میں فیض اللہ سمانی اپنی پہلی سفارت پر دکن جا رہے تھے بہمنی دربار اس وقت جن آشام سازشوں اور بغاوتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ناتجربہ کار سفیر کے لئے یہ بڑی آزمائش کی گھڑی تھی اس موقع پر مولانا منصور انہیں دم دلاسا دیا، ان کا حوصلہ بڑھایا اور پر اثر الوداعی کلمات کہے، جن کا ذکر فیض اللہ سمانی نے بڑے دل آویز انداز میں کیا ہے[۶]

---

۵ مخطوطہ زیر عنوان کے حوالے مقالے کے متن میں درج کردئے گئے ہیں۔

۶ مجمع النوادر از فیض اللہ سمانی، محمود شیرانی کلکشن (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) مخطوطہ نمبر ، ورق اس وقت کے سیاسی حالات کے لئے طبقات محمود شاہی از شرف الدین محمد بن احمد البخاری، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، مخطوطہ فارسیہ اخبار لٹ نمبر ۱۶۲ ورق ۱۶ الف و ب

اسی خاندان کے ایک اور فقیہ بزرگ تھے قاضی نجم الدین سمانی (م ۸۷۷ ھ)،[۱] جن سے فیض اللہ سمانی کو شرف تلمذ حاصل تھا[۲] انہیں ہمارے مخطوطے میں «قاضی الشیوخ وشیخ القضاۃ» کے لقب سے یاد کیا گیا ہے (ورق ۶۲ الف) شاہ عالم سے ابتداً ان کے تکدر خاطر اور بالآخر ارادت قلبی، ان کے سفر حج پر جانے کے عزم، بحری راستے کے مخدوش ہونے کے باعث ان کو اس سفر سے باز رکھنے کی شاہ عالم کی کوشش، ان کا پیہم اصرار اور آخرکار ان کی عرقابی اور اس پر شاہ عالم کے اظہار حزن وملال کی تفصیل سے ارکان دین کی حکمتوں کو سمجھنے اور انہیں برتنے کے بارے میں علماء اور صوفیاء کے ملفوظات رجحانات کے موازنے میں بڑی مدد ملتی ہے (اوراق ۶۲ الف تا ۶۳ ب)

مندرجہ بالا افادات یقیناً قیمتی ہیں لیکن اس مخطوطے کے سیاق وسباق میں ان کی حیثیت ضمنی ہے اس لئے یہاں ان کا ذکر محض مجملاً کیا گیا ہے ان کی تفصیل انشاء اللہ راقم الحروف کے مقالے «تاریخ صدر جہاں اس کے مصنف اور ان کا خاندان» کے کام آئیگی یہ مخطوطہ بجائے خود ایک نادر علمی خزینہ ہے اور اس مضمون کا مقصد اس کا تعارف کرانا اور اس گنج مخفی کی طرف اہل تحقیق کی توجہ مبذول کرانا ہے

مخطوطہ آزاد لائبریری، ضمیمہ تصوف فارسیہ نمبر ۱۳۴. اوراق: ۱۷۸، سطور ۱۷ سائز، ۶ × ۹، ۴ء۴، خط نسخ، پختہ اور ہموار، طرز کتابت بارہویں صدی ہجری سے قبل، عنوانات سرخ روشنائی سے، آیات قرآنی واحادیث نبوی پر سرخ روشنائی سے خط کشیدہ، کتابت غیر معمولی صحت کے ساتھ کی گئی ہے غلطیاں شاذ ہیں جن کی دوران تحریر تصحیح کر دی گئی ہے، چند غلطیوں کی نظر ثانی کے وقت تصحیح کی گئی ہے کاغذ احمدآبادی،[۳] جس کے متعلق مولانا آزاد

---

۱ مفتی غلام سرور نے خزینۃ الاصفیا (نولکشور ۱۲۹۰ ھ، ج ۲، ص ۷۸) میں ان کی تاریخ وفات ۹۱۱ ھ بتائی ہے. جو ہمارے مخطوطے کی شہادت کی رو سے غلط ہے.

۲ خلاصۃ الحکایات از فیض اللہ سمانی، انڈیا آفس لائبریری لندن، مخطوطہ Or 1030، ورق ۲۶۱.

3 S A K Ghori and A Rahman 'Paper Technology in Medieval India' Indian Journal of the History of Science, New Delhi, Vol I No 2, November 1966, Pp 138 & 140

لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کے انچارج ڈاکٹر شماد احمدر حاں عوری کی رائے ہے کہ یہ سترھویں صدی عیسوی کے بعد کا یقیناً نہیں ہے ۔ سر ورق کی پیشانی پر مخطوطے کے کاتب کے علاوہ کسی شخص کی یہ تحریر درج ہے : « ملفوظ حضرت قدوۃ العارفین سید سراج الدین ابو البرکات الملقب بہ شاہ عالم ابن حضرت قطب العالم سیرہ حضرت مخدوم جہانیاں قدس اللہ اسرارہم کہ در آحمدآباد گجرات آسودہ اند » ۔ اور دائیں طرف حاشیے پر پہلی سطر میں : (ن)ام این ملفوظ ، اور دوسری سطر میں (حم)ءات شاہیہ ۔ راقم الحروف نے قوسین میں مندرج حروف کا قیاساً اضافہ کیا ہے حلد بندی میں کنارے کے حروف چھپ گئے ہیں

حمد ونعت اور کسی تمہید ، یہاں تک کہ بسملہ کے بغیر مخطوطے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے : « جمعہ اولی (سرخ روشنائی سے) بتاریخ چہارم ماہ محرم سن سبع وسبعین وثمانمائۃ وارث اتم قائل لی مع اللہ وقت شاہ عالم کان اللہ لہ بار دادند » تاریخ وار بیالیس جمعے اور دو عرسوں کی محفلوں کی روئداد ہے ہر جمعے اور عرس کی روئداد کا اختتام « وصلی اللہ وسلم علی سید العالمین محمد وآلہ الطاہرین » یا « وصلی اللہ علی سید العالمین محمد وآلہ وسلم » پر ہوتا ہے لیکن سال کے آخری جمعہ ۴۲ ، بتاریخ سلخ ماہ ذی الحجہ ۸۷۷ھ اور ساتھ کے اس مخطوطے کا اختتام یوں ہوتا ہے ، « وصلی اللہ (و)سلم علی سید العالمین محمد وآلہ اجمعین سیّما علی سیدنا شاہ عالم کان اللہ ولاولادہ (وا) حفادہ کما کان لابائہ واجدادہ علیہم (ا)لتحیۃ والرضوان والرحمۃ والغفران ۔» قوسین میں درج کردہ حروف جلد بندی میں دب گئے ہیں اسی آخری صفحے کے نچلے کنارے پر کاتب مخطوطہ کے علاوہ کسی نے خط شکستہ میں پانچ اشعار لکھے ہیں ۔ « من کلام حضرت قدوۃ الزماں میر جہاں قدس سرہ العزیز » پہلا شعر ہے

اے کہ ذات خویش را مطلق مقید ساختی
رنگہای مختلف را صورت خود ساختی

حضرت شاہ عالم کو اپنی مجالس کی روئداد کے منضبط کرنے کا بڑا خیال

تھا۔انہوں نے اس کا اہتمام کپڑونج[1] کے صاحب دل بزرگ مولانا محمد دولت شر کے خلف الرشید شیخ فرید کے سپرد کر رکھا تھا۔ بعض موقعوں پر شاہ عالم خود انہیں املا کراتے تھے۔ مثلاً جمعہ ۱۷ (۲۷- ربیع الآخر) کی مجلس میں تعـــدیل ارکان صلٰوۃ سے متعلق فقہی مسائل شاہ عـالم نے خود املا کرائے۔ (ورق ۷۰ الف)۔ ان جمعات کو ضبط تحریر میں لانے کے بعد شاہ عـالم کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا (ورق ۶۱ الف) بعض موقوں پر پچھلے کسی جمعے کی روئداد مجلس میں سنائی جاتی تھی اور اس پر شاہ عـالم تبصرہ کرتے تھے (ورق ۱۰۵ ب)۔ کبھی روئداد میں ایزاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے (ورق ۱۷۱ ب) ان کے اجرا دوسرے مقامات پر خاص خاص مریدوں کو بھیجے جاتے تھے اور شاہ عالم خود اس امر میں دلچسپی لیتے تھے کہ ان کی پـذیرائی کیسی ہوئی (ورق ۷۸ الف)۔ شیخ فرید نے جمعات کو مسلسل تاریخ وار منضبط کرنے کا التزام کر رکھا تھا جسے شاہ عالم نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور فرمایا: «شیخ فرید خوب می‌کند، متابعت ملفـوظ حضرت سید الاقطاب مخدوم جہانیاں علیہ الرضوان کہ مسماست بمجـالس جـدیہ می‌کند در تعیینِ تاریخ» (ورق ۶۱ الف) شاہ عالم کے نام نامی کی مناسبت سے جمعات کے اس مجموعے کا نام «کنور محمدی» رکھا گیا، اور شیخ فرید «جامعِ کنورِ محمدی» کے لقب سے پہچانے گئے

میاں مخدوم نے جامع کنور محمـدی کی کوشش کو سراہا تو خود شاہ عـالم نے ارشاد فرمایا: کلام مستان نوشتن بےمستی میسر نیست شیخ فریـد قائم بذات دیگرے و سرمست بشراب دیگرے شدہ می‌نویسد» (ورق ۱۲ ب)۔ تصوف کے لٹریچر میں ملفوظات کا بہت وافر سرمایہ موجود ہے۔ مگر شاید ہی کسی ملفـــوظ کے جامع کو صاحب ملفوظ نے ایسا خراج تحسین پیش کیا ہو!

ہمارے مخطوطے کی بنیاد شیخ فرید کے اسی کنور محمدی پر رکھی گئی ہے۔ بیشتر جمعات میں اس کے اقتباسات درج ہیں اور ان کے بعد «این خانہ‌زاد خاکسار

1 "Kapadwanj, 23° 1' N, 73° 7' E, in Kaira District" Z A Desai, 'Inscriptions of Gujarat Sultans', Epigraphia India, Arabic and Persian Supplement, 1963, p 7

گوید» کے تمہیدی جملے کے ساتھ اقتباس کی طویل شرح شروع ہوجاتی ہے۔ مؤلف (بلکہ شارح) تفسیر، حدیث اور فقہ پر عبور رکھتے ہیں اور ان علوم کی روشنی میں متعلقہ مضمون پر بہت مبسوط، مدلل اور معقول بحث کرتے ہیں۔ بعض موقعوں پر کنور محمدی کے حوالے کے بغیر ہی مجالس جمعہ کی روئداد بیان کی گئی ہے اور یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کا ماخذ کیا ہے قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ مستوتی بھی اسی خزانے کے ہیں۔ لیکن محدثین کی اصطلاح میں مؤلف نے شاید شیخ فرید سے روایت باللفظ نہیں بلکہ بالمعنی کی ہے، اس لئے ان کے نام کی صراحت نہیں کی مؤلف نے زیر بحث مخطوطے کے پہلے جزو میں اپنے ماخذوں کی پوری تصریح کی ہوگی وہ اپنی تحریر سے بلند پایہ محدث نظر آتے ہیں اور اس علم میں توغل رکھنے والے اسناد کے بارے میں بہت محتاط ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ ہمیں اس مخطوطے کی بابت «نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم» اس لئے کوئی حتمی رائے قائم کرنا دشوار ہے

ایک اہم بات یہ ہے کہ زیر نظر مخطوطے میں مختلف مقامات پر ایسے بیانات موجود ہیں جن سے جمعات شاہیہ کی مختلف جلدوں کی ترتیب کا واضح نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

(۱) ورق ۴۰ الف پر شاہ عالم کی تصنیف رسالہ نصرۃ محمدیہ کے بارے میں درج ہے۔ «وتکثیراً للفوائد این رسالہ در جلد اول سن احدی وسبعین وثمانمائہ مذکور شد» ج اول ۸۷۱ھ

(۲) ورق ۹۳ ب «مذکور شد ارادہ آوردن از کجاست؟ ورسم کیست؟ فرمان شد: در حلیۃ المریدین بتفصیل مذکورست، از آنجا معلوم کنید این خانہ‌زاد خاکسار گوید: در جلد اول این جمعات شاہی جمعہ اولی بتاریخ ہشتم ماہ ذی الحجہ سن احدی وسبعین وثمانمائۃ بتفصیل مذکور است۔» ج اول ۸۷۱ھ

اوپر کے اقتباس میں «جلد اول این جمعات شاہی» کا فقرہ قابل غور ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مخطوطے کا نام جمعات شاہی ہے۔

(۳) ورق ۱۰۱ ب: تفسیر سورۃ مذکورہ (آیۃ لن تنالوا البر حتی تنفقو مما

تحبون) در جمعۂ سابعہ تاریخ بیستم ماہ محرم سن اثنی وسبعین وثمانمائۃ از جلد دوم بتفصیل مذکور است » ج دوم ۸۷۲ ھ

(۴) ایضاً: «قصۂ حضرت کلیم علیہ التسلیم باشان مشہور است. این خانہ‌زاد خاکسار گوید این قصہ در جمعۂ عاشرہ تاریخ ہفتم ماہ ربیع الآخر سن اثنین وسبعین وثمانمائۃ از جلد دوم بتفصیل از مثنوی مولوی مذکورست » ج دوم ۸۷۲ ھ

(۵) ورق ۹۶ الف. «رسالہ باقریہ بتمامہا در جمعہ تاسعہ وعشرون تاریخ چہار دہم ماہ ذی القعدہ سن خمس وسبعین وثمانمائۃ از جلد پنجم مذکورست »
ج پنجم ۸۷۵ ھ

(۶) ورق ۸۸ ب «تفسیر این آیۂ کریمہ (إن الله یحب التوابین) در جمعہ تاسع وعشرون تاریخ یحدہم ماہ مبارک رمضان سن ست وسبعین وثمانمائہ کہ در جلد ششم است بتفصیل گذشتہ است » ج ششم ۸۷۶ ھ

(۷) ورق ۱۲۲ ب «تفسیر این آیۂ (فاذکرونی اذکرکم) بتفصیل ہرچہ تمام‌تر در جمعہ ثانی عشر تاریخ سیزدہم ماہ ربیع الاول سن ست وسبعین وثمانمائۃ گذشتہ است » ج غیر متعین ۸۷۶ ھ

(۸) ورق ۱۰۰ ب: تفسیر این آیۂ (لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون) بتفصیل ہرچہ تمامتر وبہتر در جمعہ تاسعہ تاریخ غرہ ماہ ربیع الاول سن سبع وسبعین وثمانمائۃ از ہمین جلد گذشتہ است » ج (ہفتم) ۸۷۷ ھ

اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ موجودہ مخطوطہ جمعات شاہیہ کی دس وار جلدوں میں سے ایک ہے. دوسرے اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ جلدوں کا نمبر سنوں کی اکائیوں کے نمبر کے مطابق ہے اس طرح ۸۷۷ ھ کے جمعات اس مجموعے کی جلد ہفتم کا سرمایہ ہیں یوں ہمارا مخطوطہ جمعات شاہیہ جلد ہفتم کا مکمل نسخہ ہے

اختتامیہ کلمات اور ترقیمہ کی غیرموجودگی سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں جمعات شاہیہ کی ان جلدوں کو شاہ عالم کے سنہ وفات (۸۸۰ ھ) تک لے جانا مقصود تھا، یعنی کل دس جلدوں کا منصوبہ تھا. لیکن مرزا علی محمد لکھتے ہیں: « جمعات

شاہی مشتمل بر ہفت جلد که ملفوظ شاہیه و متضمن اسرار ربانیه ست »[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہے اور ہمارا مخطوطه جمعات شاہیه کی آخری جلد ثابت ہوا

دلچسپ بات یہ ہے کہ زیر بحث « جمعات شاہیه جلد ہفتم » کے مؤلف (یا شارح) پچھلی جلدوں کے مؤلف بھی سید محمد مقبول عالم جلالی نہیں، جیسا کہ مرزا علی محمد کا خیال ہے ۔[2] بلکه ان کے پوتے سید جعفر بدر عالم ہیں، جیسا کہ مندرجه ذیل اقتباسات سے عیاں ہے -

(۱) ورق ۵۵ الف « حضرة جدی سید محمد مقبول عالم در رسالا مرقاة الوصول الی محبة الرسول صلی الله علیه وآله وسلم فرماید . »

(۲) ورق ۶۲ ب « حضرة جدی سید محمد مقبول عالم کان الله له در رسالا چهل حکایة شاہیه فرماید . »

(۳) ورق ۹۱ الف « حضرة جدی سید محمد مقبول عالم کان الله له ، در رسالا دین المریدین نام فرموده اند »

(۴) ورق ۱۱۶ ب « وفی اللطائف الشاهیة لجدی و شیخ شیخی و سید سیدی نظام الدین ابی الفتح السید محمد مقبول عالم ، ام جلاله . »

سید جعفر بدر عالم کے والد سید جلال مقصود عالم شاعر تھے اور رضا تخلص کرتے تھے ۔[3] سید جعفر بدر عالم نے ان کے اشعار نقل کئے ہیں سید مقصود عالم نے اپنے لائق فرزند کو اپنی زندگی ہی میں مسند سجادگی پر متمکن کردیا تھا اور اپنی خلافت سونپ دی تھی[4] شاید اسی لئے وہ اپنے والد کا ذکر صلبی نہیں بلکه روحانی رشتے کے حوالے سے کرتے ہیں :-

(۱) ورق ۹۱ الف : « حضرة سیدی مقصود عالم راست کان الله له بیت .
مہر روزی مخور غم اے درویش که خدا رزق را کفیل شده است »

(۲) ورق ۱۰۰ الف « حضرت سیدی مقصود [عالم] کان‌الله له ، فرماید . بیت .

---

۱ مرآۃ احمدی خاتمه ص ۴۲ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ص ۴۳ ۴ ایضاً

طاہر شد از عرب چو جمال عزیز تو عزت ظہور یافتہ در صورت عرب

(۳) ورق ۱۰۲ ب « حضرۃ پیر دستگیر مقصود عالم کان اللہ لہ » فرماید۔
(۱۰۳ الف) بیت:

محبت لا شو و آں کہ زعیر دوست سر رصانۂ تو دریں شیوہ کمتر از مقراض [۱]

سید مقصود عالم کو بھی ان کے والد شاہ عالم نے اپنی زندگی ہی میں خلافت سونپ دی تھی اور سجادہ نشین کر دیا تھا۔[۲] وہ بھی اپنے والد کو اس روحانی رشتے سے یاد کرتے ہیں، خون کے رشتے کا ذکر نہیں کرتے۔ لطائف شاہیہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ « پیر و دستگیر حضرت شاہ عالم ادام اللہ جلالہ الخ » (لطیفہ ۲۱) دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ « ایں خاکسار در صغر سن از خدمتِ پیر دستگیر شاہ عالم پرسید۔ » (لطیفہ ۵۷)[۳]

مرزا علی محمد نے سید جعفر بدر عالم کے بارے میں لکھا ہے کہ « بدستخط خاص کتابت بسیار کردہ اند وجلد می‌نوشتند »[۴] اوپر کے صفحات میں راقم الحروف نے طرزِ کتابت، خط، اور کاغذ کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں اس سے یہ بعید نہیں کہ موجودہ مخطوطہ بھی خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔

ڈاکٹر سید اکبر علی ترمذی فرماتے ہیں کہ « جمعات شاہیہ کی جلد پنجم کی کتابت اس کی تالیف کے قریباً چھ سال بعد مؤلف کے صاحبزادے سید جلال مقصود عالم نے آگرہ میں کی »[۵] اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ سید محمد مقبول عالم سن ۸۷۵ تک مجالس کی ترتیب و تدوین کر پائے تھے کہ انہیں سفر آخرت در پیش ہوا اور اس کی تکمیل کا بیڑا ان کے پوتے نے اٹھایا، لیکن جیسا کہ اوپر

---

۱ رضا کو حقیقی میں معنوں لفظی تصویر کشی میں درک حاصل تھا۔ عزت اور عرب، (لا نہیں بلکہ) لا اور قینچی کی شکلوں کی مشابہت سے انہوں نے نکتہ آفرینی کی ہے۔
۲ مرآۃ احمدی، خاتمہ ص ۴۱ ۳ « جلالی احمد آبادی »، از اکبر علی (ترمذی)۔ نوائے ادب، بمبئی، ج ۲، نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۱ع) ص ۶۴۔ ڈاکٹر سید وارث علی ترمذی نے لطائف شاہیہ اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کردی ہے (کراچی ۱۹۷۶ع)۔
۴ خاتمہ مرآۃ احمدی، ص ۴۳-۴۴ ۵ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۴ع، ص ۵۸۔

عرض کیا جاچکا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دو جلدوں سے آگے یعنی سن ۸۷۶ھ اور ۸۷۷ھ کی مجالس کے بعد ان کی عمر نے یہی ان کا ساتھ نہ دیا۔ یوں زیر بحث مخطوطہ جمعات شاہیہ کی آخری جلد ٹھہرا، جیسا کہ اوپر درج ہے

ڈاکٹر باقر علی ترمذی مرحوم نے ایم پی، ایچ، ڈی کے مقالے کی کتابیات میں جمعات شاہیہ کی صرف چوتھی اور پانچویں جلدوں کا ذکر کیا ہے۔[1] ڈاکٹر اکبر علی ترمذی صاحب جلالی احمدآبادی پر اپنے سلسلۂ مضامین میں فرماتے ہیں کہ "بے حد کوشش کے باوجود ہم جمعات کی تمام جلدوں کا سراغ نہ لگا سکے"[2] اس مسئلے پر ان کی تحقیقات جمعات شاہیہ کی صرف پانچویں جلد تک پہنچ سکی، جس کا مفید حوالہ انہوں نے سید ہاشم کی صحائف السادات کے مخطوطے میں تلاش کرلیا ہے۔[3] ان پانچوں جلدوں کی تالیف کا انتساب بجا طور پر سید محمد مقصود عالم جلالی کی طرف کیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے مرزا علی محمد نے جمعات شاہیہ کی ساتوں جلدوں کو جلالی کی تصنیف بتایا ہے[4] معلوم ہوتا ہے کہ مراۃ احمدی کے مصنف کو جمعات شاہیہ کی سات جلدوں کا علم تو تھا، لیکن یہ ساتوں جلدیں ان کی نظر سے نہیں گذریں، اس لئے انہیں ان کے مؤلفین کے بارے میں اشتباہ ہوا

یہاں دو امور قابل غور ہیں۔ اولاً یہ کہ جمعات شاہیہ کی پہلی پانچ جلدوں اور موجودہ جلد ہفتم کے مؤلفین کے طرز تحریر میں تفاوت ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کس حد تک؟ عہد شاہجہانی کے مُورخ عبدالحمید نے لکھا ہے کہ سید جعفر مہارت علمی و کثرتِ درس و افادہ و واقفیتِ مصطلحات و التزام طریقۂ مشائخ میں اپنے جد و پدر سے بڑھکر تھے[5] کیا ان جلدوں کے موازنے سے اس کی توثیق ہوتی ہے؟

---

1 Baqirali Muhammadali Tirmidhi, The Contribution of the Scholars of Gujarat to Arabic Language and Literature, Bombay University, Ph D. disscotation, 1947

۲ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۵۷ ۳ ایضاً، ص ۵۷-۵۸

۴ دیکھئے حاشیہ نمبر ۱۲، ماسبق۔ ۵ بادشاہ نامہ از عبد الحمید بحوالہ یاد ایام یعنی مختصر تاریخ گجرات از مولانا حکیم عبد الحی حسنی، (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ)، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۹۔

ثانیاً ، مرزا علی محمد نے سید جعفر بدر عالم کی تصنیف روضات شاہیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ چوبیس جلدوں پر مشتمل ہے ، جن میں سے پہلی بیس جلدیں بزرگوں کے احوال سے متعلق ہیں ، جن کے ضمن میں بہت سی مفید باتیں بیان کی گئی ہیں اور آخری چار جلدیں احادیث و تفسیر اور دیگر فوائد پر مشتمل ہیں [1] ڈاکٹر سید اکبر علی ترمذی نے جلالی احمدآبادی پر اپنے سلسلۂ مضامین میں روضات شاہیہ کی دسویں جلد کے کئی حوالے دئے ہیں [2] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روضات شاہیہ کی جلد ہفتم اور موجودہ مخطوطے میں کیا فرق ہے ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جمعات شاہیہ جلد ہفتم کو پہلی پانچ جلدوں سے الگ کرنے کے لئے اسے روضات شاہیہ جلد ہفتم کا نام دیا گیا ہے ؟ اوپر ہم نے زیر نظر مخطوطے کے ورق ۹۳ ب کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں ایک فقرہ ہے « جلد اول این جمعات شاہی » اس سے ہم نے یہ استنباط کیا ہے کہ اس مخطوطے کا نام جمعات شاہی ہے بہ ایں ہمہ ہمارا سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے .

افسوس کہ راقم الحروف ہندوستان اور پاکستان کے مابین سفر ، بالخصوص علمی سفر کے موانع کے باعث احمدآباد نہ جاسکا اس طرح پیر محمد شاہ لائبریری اور احمدآباد کے دوسرے علمی خزانوں سے استفادہ کرنے سے محروم رہا . تاحال اُس کے سامنے جمعات شاہیہ کی طرف یہ ساتویں جلد ہے اور وہ اقتباسات جو ڈاکٹر اکبر علی ترمذی صاحب کے نوائے ادب میں شائع شدہ مقالوں میں درج ہیں اس لئے مندرجہ بالا مسائل اور ان جیسے دوسرے سوالات کے حل کرنے سے وہ قاصر ہے بہر حال ، مالایدرک کلہ لایترک کلہ ا جو کچھ دستیاب ہوسکا مقامی اہل علم حضرات کی خدمت میں حاضر ہے

ع چہ کند بے نوا ؟ ہمیں دارد

ملک القضاۃ صدر جہاں حسام الدین ملتانی نے حضرت شاہ عالم سے علمی مباحثے کے بعد ان کی جلالت علمی کا اعتراف میاں مخدوم کے سامنے یوں کیا تھا « میاں ا پیر شما چنانچہ در طریقت کاملست ، در شریعت نیز کاملست » [3] لیکن اس مخطوطے

---

۱ خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۴۳ ۲ نوائے ادب ، اپریل ۱۹۵۱ع ، ص ۵۹ ، ۶۱ ، ۶۲ .
۳ خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۱۰۱ .

کے مطالعے کے بعد شاہ عالم کے بارے میں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ " چنانچہ در شریعت کامل بود در طریقت نیز کامل بود ، یہ ملفوظ حضرات صوفیائے کرام کے عام ملفوظات گرامی سے مختلف طریقے کی چیز ہے یہاں اسرار طریقت پر علوم شریعت کا غلبہ ہے حضرت شاہیہ کی جمعے کی یہ مجالس تفسیر ، حدیث اور فقہ پر عبور رکھنے والے ایسے عالم دین کی درس گاہ نظر آتی ہیں جو علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ بصیرت قلبی کی دولت سے بھی مالامال ہے ۔ یہ امر محض اتفاقی نہیں بلکہ حضرت شاہ عالم کی تعلیم کی اساس ہے جامع کنوز محمدی روایت کرتے ہیں کہ میں نے قاضی عیسیٰ کے لئے خلافت کی سفارش کی ۔ « فرمان شد علم دارد ؟ عرض کردم شغل عبادت دائمی دارد . فرمان شد اول علمی می باید با تبحر وآخر لا ادری ۔ » (ورق ۱٦٦ ب) آخری جملہ علوم ظاہری میں تبحر کی دعوت تو دے ہی رہا ہے ، ساتھ ہی « و آخر لا ادری » (باقی میں نہیں جانتا) علم لدنی کی اس سرحد کا سراغ بتا رہا ہے جس کے لئے کہا گیا تھا کہ آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد ۔

حضرت شاہ عالم نے ایک رسالہ تصنیف فرمایا تھا جس میں ایسی احادیث نبویہ جمع کی گئی تھیں جن میں « ثواب و نفع علم و فضل علما » کا بیان تھا ۔ اس کا نام رسالہ باقریہ رکھا گیا تھا ہمارے مخطوطے (ورق ۹٦ الف) سے پتا چلتا ہے کہ یہ رسالہ « بتمامہا » جمعات شاہیہ جلد پنجم میں نقل کر دیا گیا ہے ۔ اسی جلد کے ایک جمعہ میں شاہ عالم کا یہ فرمان نقل کیا گیا ہے ۔ « بہ طلبۂ علم فرمان شد عزیزاں در علوم دینیہ غور کنید کہ گفتہ اند علم فقہ است و تفسیر و حدیث ہر کہ داند غیرازیں گردد خبیث »[1] جمعات شاہیہ کی جو جلد ہمارے پیش نظر ہے اس میں مندرجہ بالا فرمان کی عملی تصویر ہے ۔

علوم شرعیہ کے اس غلبے کا ایک سبب شاید سید جعفر بدر عالم کا اپنا علمی مذاق ہے ۔ « خامہ زاد خاکسار » کی تشریحات و توضیحات سراسر عالمانہ ہیں ۔ لیکن ایک تو یہ خود حضرت شاہ عالم کی تعلیم کے زیراثر تھا ۔ دوسرے ، جہاں کنوز محمدی یا دوسرے راست مصادر نے شاہ عالم کی عالمانہ تقریر کو بالتفصیل قلمبند

---

۱ جمعات شاہیہ ، جلد پنجم ، جمعہ ۲۳ ، بحوالۂ نوائے ادب ، جولائی ۱۹۵۴ع ، ص ۲۸

کرلیا ہے یا شاہ عالم کی اپنی تصنیف نقل کی گئی ہے ان کے مطالعے سے ان کی علمی رفعت شان صاف نظر آتی ہے ان کی علمی تصانیف مستقل کتابی شکل میں باقی نہیں رہیں لیکن جمعات شاہیہ میں ان میں سے اکثر کو محفوظ کرلیا گیا ہے۔ رسالہ باقریہ کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے ہمارے مخطوطے (ورق ۴۰ الف) سے ایک اور رسالہ نصرۃ محمدیہ کا سراغ ملتا ہے، جس میں سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل کے بارے میں احادیث جمع کی گئی ہیں اور ان کی توضیح و تشریح ہے۔ یہ رسالہ بھی «تکثیراً للفوائد» جمعات شاہیہ جلد اول میں «بتمامہا» نقل کردیا گیا ہے۔ ہمارے مخطوطے میں یہ بیان ہے کہ اس رسالے کا دیباچہ ۸۷۷ھ کے ساتویں جمعہ (۱۷ صفر) کی مجلس میں پڑھا گیا اور شاہ عالم اس کے اقتباسات پر مزید توضیحات پیش فرماتے رہے یہ اقتباسات مع افادات اوراق ۴۰ الف تا ۴۱ الف پر درج ہیں

حضرت شاہ عالم کا رسالہ صفویہ خود ہمارے مخطوطے میں سارے کا سارا محفوظ کرلیا گیا ہے (اوراق ۱۳۴ ب تا ۱۴۱ ب) اس کی فصل اول میں حضرت آدم کی پیدائش، دوم میں انسان کی پیدائش اور سیوم میں رحم مادر میں بچے کی پرورش پر علمی مباحث ہیں فصل سیوم میں علم جنین کے طبی نکات قابل غور ہیں اور اس ساری طبی و شرعی مباحث کا نتیجہ حقوق والدین کا مضمون قاری کے ذہن نشین کرانا ہے یہ رسالہ تعلیم ظاہری و تربیت باطنی یعنی شریعت و طریقت کے امتزاج کا نمونہ ہے جو تعلیمات شاہیہ کا خاصہ ہے۔

مخطوطۂ زیر نظر میں سب سے زیادہ تفسیری مباحث ہیں بسم اللہ الرحمن الرحیم کی مبسوط تفسیر، سورۃ الناس میں لفظ «ناس» کی تفسیر میں علمی و لغوی نکات، إنک لعلی خلق عظیم کے ذیل میں خلق محمدی کی دلاویز تفصیلات، إنّ اللہ یحب التوابین کی تفسیر کے ضمن میں توبہ کی درد انگیز دعوت، اذکرونی أذکرکم کے تحت اور اوراد واذکار کے دلنشین نکات، غرض کس کس آیت کی تفسیر کا ذکر کیا جائے کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست تفسیری مباحث کے بعد احادیث کی تشریح کا نمبر آتا ہے خلق محمدی، فضائل مصطفوی، معجزۂ شق القمر، اور معراج پر مفصل

اور محدثانہ مباحث ہیں اور پھر عبادات کے ضمن میں وضو ، تعدیل ارکان صلٰوۃ صوم ، اعتکاف اور زکوۃ وغیرہ پر فقیہانہ درس و تدریس کے مضامین ہیں

شاہ عالم کے زمانے میں سید محمد جونپوری کی دعوت کی وجہ سے ظہور مہدی کا بہت چرچا تھا سید محمد جونپوری شاہ عالم سے ملے تھے اور ان پر اپنے بارے میں انہوں نے بہت اچھا اثر چھوڑا تھا شاہ عالم نے ان کے کمال علمی وصفائی باطنی کا فراخ دلانہ اعتراف کیا ہے لیکن مہدویت کے اظہار سے وہ چنداں خوش نہ تھے۔[1] اس بارے میں شاہ عالم کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے مہدویت کے مسئلے پر بحث و مباحثہ نے جلد ہی جدال و قتال کی شکل اختیار کرلی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم کے ماننے والوں میں خود ان کے مہدیٔ آخر الزماں ہونے کا کچھ چرچا تھا ، اللہ دیا شاعر نے تو اپنے قصیدے میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے صاف صاف یہ کہا کہ

اے مہدیٔ زماں تو ظاہر ز دیگراں از بہر دفع فتنۂ آخـــر مو حری

(ورق ۵۰ الف) لیکن شاہ عالم جس بات کو سید محمد جونپوری کے لئے غلط سمجھتے تھے اپنے لئے کیسے قبول کرلیتے ۔ اس لئے بات اللہ دیا شاعر کی شاعری سے آگے نہیں چلی ۔ اس پس منظر میں یہ امر لائق توجہ ہے کہ سید جعفر بدر عالم نے مشکوٰۃ شریف کی ان دو فصلوں کو محدثانہ تشریحات کے ساتھ نقل کرنے کا موقع ڈھونڈ نکالا ہے ، جن میں مہدیٔ آخرالزماں اور ان کے ظہور کے بارے میں احادیث صحیحہ درج ہیں ۔ (اوراق ۱۶ ب تا ۱۶۶ ب)

حضرت شاہ عالم پیر کامل تھے ۔ روحانی تصرفات کے مالک تھے ان کی کرامتوں کا ذکر ناگزیر تھا لیکن تعجب یہ ہے کہ زیر نظر مخطوطے میں اس کی مثالیں شاذ ہیں سب سے نمایاں کرامت تو اللہ دیا شاعر کی صحت یابی کا واقعہ ہے

---

1 S C Misra & M L Rahman (eds), The Mirat i Sikandari, Deptt of History Series No 3, M S Baroda University, 1961, pp 170-71

«فرمودند مردیست صاحب حال ، سخنان خاص تمام می گوید وملاحظہ تکلموا الناس علی قدر عقولهم نمکند آنچه فهم می‌شود اینست که بعد از فوت سید اصحاب الشیان فتنه سر برخواہد زد»

جس کا ذکر ہم شروع میں کرچکے ہیں لیکن اس کا بیان جس قدر سرسری طور پر اس مخطوطے میں کیا گیا ہے وہ بجائے خود تعلیمات شاہیہ کا ایک کرشمہ ہے، پورا اقتباس نقل کرنے کے لائق ہے «شخصے الله دیا نام که لنگ و کورو گنگ مادر زاد بود پابوس نمود فرمودند برخیز و ببین و بگو فی الحال برخاست و چشم کشاد و بدیہه خواند» (ورق ۴۹ ب) اس کے بعد ایک شاندار قصیدہ ہے، جس کے اکثر اشعار ڈاکٹر اکبر علی ترمذی صاحب نے صد حکایات شاہیہ کے حوالے سے نوائے ادب (اکتوبر سن ۱۹۵۴ء، ص ۳۲) میں نقل کردئیے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر اسی قصیدے کا ہے

تصوف کے سلسلے میں زیادہ تر مروجہ تصوف کی اصلاح کے مضامین ہیں۔ تصوف سراسر تزکیۂ باطن کا نام تھا لیکن شاہ عالم کے زمانے تک پہنچتے ہوئے اس نے ظاہری رسوم کی شکل اختیار کرلی تھی، جس میں خاص طرز کے لباس اور رکھ رکھاؤ پر سب سے زیادہ زور تھا شاہ عالم نے اسی کی سب سے زیادہ مخالفت کی اس ریاکاری کو شرک خفی قرار دیتے ہوئے عوام الناس کا لباس اختیار کرنے کو اپنی خلافت کی لازمی شرط قرار دیا اس کا نمونہ قائم کرتے ہوئے خود سپاہیانہ بلکہ سپہ سالارانہ طرز زندگی اختیار کیا اس باب میں ان کے جذبات کی شدت اور حدت کا اظہار ان الفاظ میں ہوا ہے - «نامردی چیست؟ پوشیدن گلیم و تسبیح که زنار مرائیان که مشرکان خفی اند و انمودن و مردانگی چیست؟ پوشش عوام الناس پوشیدن و حال خود راستر کردن و نہایتہ مردانگی چیست؟ نان از کسب خوردن . . نہایت نامردی چیست؟ شغل مع الله را وسیلۂ کسب نان کردن» (ورق ۹۰ ب)

حضرت شاہ عالم کے نزدیک صوفی کے لئے لازم ہے کہ وہ خلق سے بے نیاز ہو وہ فرماتے ہیں: «درویشی چیست؟ بے طمع شدن از خلق و غنی شدن از ماسوا الله تعالے» اس وصول کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مثال دی کہ قطب الدین «طاب الله ثراه» نے کئی لاکھ روپوں کی تھیلی («پُتہ چند لکه تنکه») انہیں پیش کی مگر انہوں نے «بصدقۂ پیران خود» اور «احلالاً لحرمته الله تعالٰی» اسے قبول نہیں کیا (ورق ۱۶۵ الف) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قطب الدین نے نہ صرف زر بلکہ

زاری سے بھی حضرت شاہ عالم کی طرفداری حاصل کرنے اور انہیں فتح خان بھی
مستقل کے سلطان محمود بیگڑہ کی پشت پناہی سے دستبردار کرنے کی کوشش کی
تھی حصات شاہیہ، جلد پنجم، حصہ ۲۴ کی مجلس میں ذکر ہے کہ « سلطان قطب
الدین طاب اللہ ثراہ اشعار ہندی در مدح آنحضرت دارد » ان میں سے مندرجہ ذیل
شعر ڈاکٹر اکبر علی ترمذی صاحب نے نقل کیا ہے۔

مجھیں شاہ جہانیاں جس دیٹھا سُجھاں
شاہوں کیرا شاہ توں دو نہ جل [جگ ؟] تیری آن [1]

جب زاری و زر سے کام نہ بنا تو سلطان قطب الدین نے زور آزمائی بھی خوب کی
ہمارے مورخوں نے پہلی دونوں طرح کی کوششوں کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن دباؤ ڈالنے
کی تدبیریں تفصیل کے ساتھ قلمبند کی ہیں مگر جو ماسوی اللہ سے غنی ہو اس
پر کسی کا زور کب چلا ہے ؟

حضرت شاہ عالم کے زمانے میں خلافت و سجادہ نشینی ایک رسم بن چکی
تھی۔ اس لئے انہوں نے اس کی اہمیت کو بحسن و خوبی کم کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ
«ہر کہ بر طریقۂ مشائخ ماست، خلیفۂ ماست » (ورق ۱۶۶ ب) پیری مریدی کے
دائرے میں بھی انہوں نے عالمگیر وسعت کی دعوت دی۔ اور اس مضمون کو بڑے
دلنشیں پیرایے میں بیان فرمایا کہ « یاران! مرا ہمہ خلق دوستیست از سہ جہت۔ یکے
آنکہ ہمہ خلق مخلوق یک خالقیم۔ دوم آنکہ ہمہ امت حضرت مقدسہ سید عالمیم
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ سیوم آنکہ ہمہ مریدان حضرت سید الاقطاب مخدوم جہانیانیم
علیہ الرضوان حکماً چراکہ ہمہ مریدان حضرت سید العرب علی بن ابی طالب رضی اللہ
عنہ [اند] و مرید پدر مرید پسر ست، سیما اذا کان والدہٗ بسلک طریقہ » (ورق ۶۰
الف) اپنے مشائخ کے طریق کی وضاحت کے طور پر انہوں نے خلافت کی تین شرطیں
متعین کردیں پہلی یہ کہ کسی شخص سے کسی چیز کی طلب نہ رکھے۔ کسی دنیادار
کے در پر دستک نہ دے، خواہ کسی اور کی حاجت روائی کے لئے کیوں نہ ہو
کوئی مدد معاش یا وظیفہ قبول نہ کرے۔ دوسری یہ کہ جیسا اندر ہو ویسا ہی اپنے

---

۱ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۴ ع، ص ۴۳

آپ کو باہر پیش کرے جو کپڑے گھر میں پہنتا ہو وہی باہر پہنے اپنے اچھے کاموں کو چھپانے کی کوشش کرے اور برے کام کے سرزد ہوجانے پر مخلوق کے آگے نہیں بلکہ خالق کے سامنے شرمسار ہو۔ تیسری یہ کہ سب کے ساتھ مساوی سلوک کرے خلاصہ یہ کہ خودداری و استغنا، ریاکاری سے مکمل اجتناب اور مساوات: خلافت شاہیہ کے یہ تین بنیادی اصول تھے (اوراق ۵۷ ب و ۱۶۶ ب تا ۱۶۸ الف ملخصاً)

حضرت شاہ عالم کے نزدیک سماع چشتیوں کا طریقہ ہے اور اس کے بہت سے آداب حضرات چشت کے یہاں ہیں (ورق ۹۳ ب) شاہیہ سلسلے میں بھی سماع کا رواج تھا لیکن اس کے آداب اور بھی سخت تھے مجلس سماع میں مزامیر تو الگ رہے، راگ تک کی ممانعت تھی۔ حضرت شاہ عالم کا دو ٹوک فرمان تھا کہ «سرود شنیدن در مجلس سماع نا مشروع ست» (ورق ۱۷۴ الف)۔ ہاں، اگر کوئی کامل شخص نیک نیتی کے ساتھ سرود سنے تو اس کے لئے بھی یہ شرط تھی کہ اس کے اور گانے والے کے درمیان پردہ حائل ہو لیکن ایک مرتبہ ایک عزیز نے راگ کے ساتھ («سرودبستہ») جکری یعنی مقامی زبان کے گیت چھیڑ دئیے شاہ عالم نے اس کا دل رکھنے کو («تطیب خاطراو») یہ راگ سن تو لیا، مگر اس کے لئے عذر یہ پیش کیا کہ «سرودے کہ حالا خواندند خود مدح خاندان طہارت ست و مدح ایں خاندان عبادتست» (ایضاً)

اہل بیت کی منقبت عبادت کیونکر ہے؟ اس مسئلے پر حضرت شاہ عالم نے طویل تقریر فرمائی جس میں آیت قرآنی لا أسئلكم عليه أجراً إلا المودة في القربىٰ کی تفسیر پیش کی۔ تفسیر کشاف اور تفسیر حسینی کے حوالے دئیے احادیث صحیحہ سے استناد کیا اور بات اس پر ختم کی کہ «محبت خاندان اہل بیت محبت حضرت مقدسہ سید عالم ست صلی اللہ علیہ و سلم و محبت آنحضرت محبت خدا ست»
(اوراق ۱۷۴ تا ۱۷۵ ب)

حضرت شاہ عالم کے حب اہل بیت پر اس اصرار نے شاید اس خیال کی پرورش کی کہ وہ شیعی یا کم از کم تفضیلی ضرور تھے۔ ڈاکٹر اکبر علی ترمذی نے اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور متعدد مستند شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ

کیا ہے کہ وہ نہ شیعی تھے نہ تفضیلی.[1] ہمارے مخطوطے کے ہر دوسرے تیسرے صفحے پر سنی علماء کی مستند اور متداول کتابوں کے حوالے موجود ہیں جس سے ڈاکٹر ترمذی صاحب کے بیان کی توثیق ہوتی ہے لیکن راقم الحروف کے نزدیک جس کا فرمان یہ ہو کہ «یاران! مرا ہمہ خلق دوستیست» اس کے بارے میں مذہب کی یہ بحث کسی حد تک خارج از آہنگ نظر آتی ہے ہاں، تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے ان کے مسلک کا تعین ضروری ہو تو یہ کہنا چاہئیے کہ وہ یقیناً سنی تھے مگر تولائی

حضرت شاہ عالم نے ایک بنیادی اصلاح یہ کی کہ ہندوستانی تصوف کے سلسلے میں انہوں نے اناطولیہ اور مشرق اوسط کے دوسرے ممالک کے تاتاری حملوں کے بعد کے صوفی سلسلوں کے «غازی مرابط» کی روایات کو سمویا خانقاہ شاہیہ رسول آباد کو فوجی رباط میں تبدیل کر دیا. خود سپاہیانہ زندگی اختیار کی اور اپنے مریدوں کو ہتھیاروں سے لیس ہونے کی تلقین کی ہمارے مخطوطے کے حصے (سلخ ذی الحجہ ۸۷۷ھ) کی مجلس کا ذکر ہے کہ شاہ عالم کے مریدوں میں سے چند تلوار سے مصلح تھے اس پر ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ تلوار آلۂ قطع ہے اور پیری مریدی ذریعۂ وصل ان دونوں کا کیا جوڑ؟ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بیعت لیتے وقت مشائخ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ہتھیار قسم کی چیزیں ہٹا دیتے ہیں. حضرت شاہ عالم نے فرمایا کہ مشائخ طریقت بزرگ لوگ ہیں جیسا وہ فرمائیں اس پر عمل کرنا چاہئیے. مگر میں تو «تیغ دار حضرت مقدسہ صلی اللہ وآلہ وسلم» ہوں. اور اپنے مریدوں کو بھی تلوار باندھنے کی وصیت کرتا ہوں اور میں کہتا ہوں کہ «ہر کہ مرید ماست، شمشیر باید کہ می بستہ باشد بلکہ جمیع اسلحہ باخود دارد وہر کہ چنیں نکند او مرید من نیست وفردائے قیامت انشاء اللہ تعالی آنحاہم مریدان خود را مسلح می برم» سید جعفر بدر عالم نے اس حصے کی روئداد کی تمہید میں حضرت شاہ عالم کو «تابع قائل انا النبی السیف صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم» بتا کر اُن کے طرز عمل کے لئیے اُسوۂ حسنہ سے نظیر پیش کر دی (ورق ۱۷٦ الف وب)

الغرض طریقۂ صوفیاء میں حضرت شاہ عالم کا اپنا جداگانہ اجتہادی رنگ تھا

بلکہ بعض لحاظ سے اسے آج کل کی زبان میں انقلابی کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ یقیناً وہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھے اس لئے ان کی اصلاحی کوششیں بارآور نہ ہوئیں ان کے بعد یہ اصلاحات نافذ نہ وہیں بلکہ ان کی یاد بھی دھندلا گئی مرآۃ سکندری اور مرآۃ احمدی گجرات کی مستند اور مایۂ ناز تاریخیں ہیں۔ ان کے آئینے میں دیکھئے تو حضرت شاہ عالم ٹھیٹ مروجہ تصوف ہی کی ایک بلند و بالا شخصیت نظر آتے ہیں ان میں اور ہم‌عصر دوسرے اکابر صوفیا میں اگر کچھ فرق پایا جاتا ہے تو صرف جلالت شان کا صاحب مرآۃ سکندری مرزا منجھو نے تو غضب یہ کیا کہ ان کی طرف یہ جملہ منسوب کر دیا کہ «در خانۂ ما سرود ہست، مزامیر ہست، لباس ابریشمی ہست ہر کہ ہمہ اینہا قبول کند در صحبت ما نشیند۔»[1] یہ جملہ بہت مشہور ہوا لیکن اس کی کوئی اصل نہیں بلکہ پچھلے صفحات پر جو شواہد پیش کئے گئے ہیں ان کے یہ سراسر خلاف ہے۔

میرزا منجھو نے مندرجہ بالا جملہ «شریعت پناہ قاضی نجم الدین» اور حضرت شاہ عالم کے درمیان معارضے کی حکایت کے ضمن میں حضرت شاہ عالم کے منہ سے کہلوایا ہے۔ حکایت مختصراً یہ ہے کہ سلطان محمود بیگڑھ کا ایک خادم سلطان کے لئے ایک قیمتی رباب لئے جا رہا تھا کہ قاضی صاحب کی نظر اس پر پڑی وہ جلال میں آگئے اور اسے توڑ ڈالا بادشاہ کو خبر لگی تو اس نے کہا کہ «نیچو بیری کو سب کوئی جھورے» قاضی صاحب میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایسا ہی ولولہ ہے تو وہ «باپ جیو» (یعنی حضرت شاہ عالم) کو ریشمی کپڑے پہننے اور مزامیر سے سرور حاصل کرنے سے کیوں نہیں روکتے؟ قاضی صاحب نے یہ چیلنج قبول کیا۔ اور ایک کاغذ پر ان محرمات کے بارے میں قرآن وحدیث کے احکامات لکھکر اور اسے اپنے عمامے میں اُڑس کر رسول آباد جا پہنچے حضور شاہیہ میں پہنچا تھا کہ ہوش اڑ گئے کاغذ نکالا تو سفید کورا نکلا قدموں میں پڑ گئے اور حضرت کے در کی ملازمت کی درخواست کی۔ اس موقع پر میرزا منجھو کے قول کے مطابق حضرت شاہ عالم نے قاضی صاحب کو مخاطب کرکے مندرجہ بالا جملہ کہا تھا عرض، ملازمت دربار حضرت شاہیہ اختیار کی خلاف

---

۱ مرآۃ سکندری مرتبہ ستیش چندرا مصرا و محمد لطف الرحمن، بحوالہ بالا، ص ۱۴۱

سے سرفراز ہوئے مدارج عرفانی بلند ہوئے

میرزا محمد ہو نے تو حسب معمول «نقل ست» کہکر یہ حکایت بیان کردی ہے۔ اپنا ماخذ بتانے کی زحمت نہیں کی لیکن یہی حکایت سید محمد مقبول عالم جلالی (۹۸۹ھ - ۱۰۴۵ھ) نے محدثانہ اسلوب کے مطابق اپنے ہمعصر قاضی عماد الدین سے روایت کی ہے، جو خود قاضی نجم الدین کے صاحبزادے تھے اس مستند روایت کی تفصیلات بہت مختلف ہیں اس میں رباب کا کوئی ذکر نہیں سلطان کی برہمی خاطر کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ قاضی نجم الدین نے کسی مقرب بارگاہ سلطانی پر کوڑوں کی حد جاری کرادی تھی، جس پر سلطان نے وہ مشہور کہاوت کہی جو میرزا محمد ہو نے بھی نقل کی ہے یہاں «باپ جیو» پر سلطان نے سرود ومزامیر اور لباس حریر کا الزام نہیں لگایا۔ بلکہ ان کے سپہ سالارانہ یا شاہانہ کر وفر پر اعتراض کیا۔ یہ کہا کہ خدام ان کے دائیں بائیں («میمنہ ومیسرہ» میں) اس دھج سے کھڑے ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں جڑاؤ دستے والی تلواریں ہوتی ہیں پشت کی جانب زربفت کا سرا پردہ پڑا ہوتا ہے۔ فرش، چھت، دروازے سب اسی طرح آراستہ وپیراستہ ہیں اس طرح سراسر غیر درویشانہ زندگی بسر کرنے پر شاہ عالم کو ٹوکنے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے تقاضے پورے کرنے کے لئے قاضی صاحب آمادہ تو ہوئے لیکن انہیں حضرت شاہ عالم کے شمشیر بکف خادموں سے ڈر لگا۔ بادشاہ سے کمک مانگی۔ بادشاہ نے کہا کہ «تائید شریعت» کے لئے میں فوجی دستہ تمہارے ساتھ بھیجے دیتا ہوں۔ یوں لاؤ لشکر سے لیس قاضی نجم الدین بنانی حضرت شاہیہ میں پہنچے باقی قصہ کم وبیش اسی طرح ہے جیسے میرزا محمد ہو نے بیان کیا ہے۔[1]

گویا تفصیلات سے قطع نظر بنیادی طور پر دونوں روایتیں ایک ہیں فرق صرف

---

۱ چہل حکایت شاہیہ، حکایت نمبر ۱۶۔ اس کا مخطوطہ پیر محمد شاہ لائبریری میں محفوظ اور راقم الحروف کی دسترس سے دور ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے کتب خانہ مدرسہ محمدیہ، جامع مسجد، بمبئی میں اس کا عربی ترجمہ موجود ہے جو سید جعفر بدر عالم کی فرمائش پر ان کی زندگی میں ان کے صاحبزادے محبوب عالم نے کیا تھا۔ مخطوطہ نمبر ۳۵۴/۱۷/۲، ص ۲۲-۲۵۔

اتنا ہے کہ سید محمد مقبول عالم حلالی کی روایت میں «شمشیر وسنان» کی الکار ہے تو میرا محھو کی حکایت میں «طاؤس ورباب» کی جھنکار ہے۔ وستاں بیھما!

راقم الحروف کو لمعات شاہیہ کی صرف ایک جلد کے مطالعے کی سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن نمونہ مشتے از خروارے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب ملفوظات کے گراں قدر سرمایے کی سرتاج ہے۔ شریعت اور طریقت کی بصیرت اور ہم آہنگی، علوم ظاہری کے اہم نکات، طریقـــۂ صوفیاء کے بارے میں دور رس اجتہادات، تصوف کے شیریں، متواضع اور مدھم لہجے، ایماں کی پختگی کی عطا کردہ رواداری، خود اعتمادی پر مبنی صلح کل — ان سب کو سمو لینے کی ایسی دل آویز مثال کہیں نظر آتی ہے تو وہ مخـــدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے مکتوبات ہیں لیکن خود شاہ عالم جیسے شمشیر بکف، شیریں زباں، صوفی صافی کی نظیر ڈھونڈنے کے لئے نظر بریلی کے سید احمد شہید پر جا ٹھہرتی ہے سید شہید کو دنیا نے صرف مجاہد کی حیثیت سے جانا، صوفی طریقت کے لحاظ سے ان کی رفعت شان کو نہیں پہچانا شاہ عالم کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہوا «تیغ دار حضرت مقـدسہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم» والا برج تاباں خانقہوں پیری کے حجاب میں چھپا رہا یہ عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ شاہ عالم کی شمشیر کبھی میان سے باہر نہیں آئی۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن میاں میں رہتے ہوئے ان کی شمشیر نے اس سلطان کی پشت پناہی اور پرورش کی، جس کے لئے کہا گیا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی روح نے اس کے قالب میں دوبارہ جنم لیا تھا۔[۱] اس شمشیر در نیام کا وہ دبدبہ تھا کہ آخرکار خود یہی پرورش سلطان بھی اس سے خوف زدہ ہوگیا قاضی نجم الدین والی حکایت سے اس کے خوف کا صاف پتہ چلتا ہے یہ اور بات ہے کہ خود حضرت شاہ عالم اور ان کے متوسلین کو اس کا ذرا ملال نہ تھا اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے حضرت شاہ عالم کے پڑپوتے اسے «السلطان المحمود العاقبۃ علیہ الرحمـۃ الغفراں» کے دعائیہ کلمات ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اور حرف شکایت زباں قلم پر نہیں لاتے۔

---

۱ مراۃ سکندری، محولا بالا، ص ۱۰۲۔

جماعت شاہیہ کا ایک اہم ترین پہلو اس کا تاریخی دستاویز ہونا ہے مظفر شاہی گجرات کی سیاست کو سمجھنے کے لئے پہلے بخاری سیدوں کی سیاسی حکمت عملی کو جاننا ضروری ہے۔ انہیں بخوبی جانے بغیر اس زمانے کے گجرات کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں قیاس آرائیاں تو کی جاسکتی ہیں، حقیقت حال تک پہنچنے کے لئے ملفوظات کے اس عظیم اور ضخیم مجموعے کا بغور مطالعہ کئے بغیر چارہ نہیں لیکن افسوس کہ یہ خزینۂ علمی تاریخ کے طالب علموں کی دسترس سے باہر ہے

یہ ضرور ہے کہ اب تک جمعات شاہیہ کی تمام جلدوں کا پتہ نہیں مل سکا ڈاکٹر سید اکبر علی ترمذی صاحب کی تحقیق سے پانچ جلدوں کا سراغ لگا تھا۔ ساتویں جلد کا تعارف اس مضمون میں کرایا گیا ہے۔ چھٹی جلد کا اب تک پتہ نہیں۔ الا یہ کہ وہ روضات شاہیہ جلد ششم کے پردے میں پنہاں ہو جمعات کی جلدوں کی تلاش کا کام یقیناً جاری رہنا چاہئے۔ لیکن جو جلدیں محفوظ ہیں ان کی اشاعت کا کام بھی شروع ہوجانا چاہئے ان کی اشاعت تلاش کے کام میں مدد ملیگی۔

●

ضمیمہ

حضرت شاہ عالم کے رسائل

راقم الحروف نے حمعات شاہیہ جلد ہشتم کے مطالعے کی بنیاد پر حضرت شاہ عالم کے تین رسائل، یعنی رسالہ نصرۃ محمدیہ، رسالہ باقریہ اور رسالہ صفویہ کا پتہ چلایا تھا. ڈاکٹر باقر علی محمد علی ترمذی مرحوم کہیں زیادہ خوش قسمت تھے. حمعات کی چوتھی اور پانچویں جلدیں اور لطائف شاہیہ ان کی ذاتی لائبریری کی زینت تھیں (اب وہ معلوم نہیں کہاں ہیں؟). اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالے کے لئے انہوں نے ان تینوں کتابوں کا، بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا. یہ مقالہ غالباً اب تک شائع نہیں ہوا. اس کا ٹائپ شدہ نسخہ بمبئی یونیورسیٹی لائبریری میں موجود ہے.

اس Typescript کے صفحہ ۹۰ اور ۹۱ پر مرحوم ڈاکٹر صاحب نے حضرت شاہ عالم اور ان کے اسلاف کے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں. جو مرآۃ احمدی سے ماخوذ ہیں صفحہ ۹۲ سے صفحہ ۹۴ کی ابتدائی سطروں تک انہوں نے شاہ عالم کے رسائل کی فہرست، ان کے کوائف کی بابت مختصر اشاروں کے ساتھ، فراہم کی ہے. یہ خاصے کی چیز ہے. حضرت شاہ عالم کی تعلیمات کو سمجھنے میں یہ فہرست ممد ثابت ہوسکتی ہے اور شاید حمعات شاہیہ کی اشاعت (یا مدرجۂ آخر صرف ان رسائل کی اشاعت) کے لئے مہمیز کا کام دے سکتی ہے.

ذیل میں ڈاکٹر ترمذی مرحوم کے افادات درج کئے جارہے ہیں ان کے بعد راقم الحروف اپنی چند گزارشات پیش کریگا

فہرست رسائل شاہیہ :-

(۱) الرسالۃ الحمدیہ[1] - یہ دو حصوں (اقسام) پر مشتمل ہے اول فی مناجاۃ

---

۱ اس کا مختصر سا اقتباس سید مقصود عالم کے رسالہ مرقاۃ الوصول کے حوالے سے ہمارے مخطوطے میں درج ہے (ورق ۵۵ الف-ب)

العاشقین.[1] ثانی فی حکایت المقربین (جمعات، جلد چہارم ص ۵۹)

(۲) الرسالہ فی مناقب الخلفاء الراشدین - اس رسالے میں بالترتیب چاروں خلفاء کے مناقب درج ہیں. (ایضاً، جلد چہارم ص ۶۸)

(۳) الرسالۃ الحسینیۃ - "واحد الموجود" کے مفہوم سے بحث کی گئی ہے اور عقائد کے چند مسائل کا بھی ذکر ہے (حوالہ موجود نہیں ہے ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مقصد غالباً یہ ہے کہ وحدت الوجود سے پیدا ہونے والے مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے)

(۴) الرسالۃ الرضائیۃ - توکل کے طریقے سے متعلق ہے (جمعات، جلد پنجم ص ۲۰۵)

(۵) الرسالۃ الکاظمیہ - اس کا موضوع جہاد اور اس کے مقاصد ہیں (حوالہ نہیں دیا گیا).

(۶) الرسالۃ الصادقیۃ - جبر واختیار کے بارے میں (جمعات، جلد چہارم ص ۱۹ اور جلد پنجم ص ۲۱۴)

(۷) الرسالۃ الاشقریۃ - سید علی اشقر الملقب بہ جمال اللہ کے نام معنون ہے۔ حضرت شاہ عالم ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ (جمعات، جلد پنجم ص ۱۷۱)[2]

(۸) رسالۂ صفیہ - ۱۱-محرم ۸۷۳ھ کی مجلس میں اس کا ذکر آیا، جس سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ یہ اس سے پہلے تصنیف کیا گیا ہوگا (جمعات، جلد چہارم، خطبہ نمبر ۲ [؟]) [نام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ فارسی میں ہوگا].

---

۱ یہ حصہ لطائف الشاہیہ کے لطیفہ نمبر ۵۹ میں منقول ہے. نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۴ع، ص ۶۹ ۲ ڈاکٹر سید اکبر علی صاحب نے روضات شاہیہ جلد دہم کا اقتباس نقل کیا ہے جس میں بخاری سیدوں کے شجرۂ نسب کے بارے میں مفید معلومات ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیبوبت کے بعد جعفر بن علی بن محمد بن الجواد بن علی الرضا خاندان اہل بیت کے سرپرست بنے یہ جعفر الثانی کے نام سے مشہور ہیں ان کے صاحبزادے علی اشقر کے ایک بیٹے عبداللہ عابد بن علی الاشقر بخاری سیدوں کے اور دوسرے بیٹے اسمعیل علی الاشقر بھکری سیدوں کے مورث اعلی تھے نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۱ع، ص ۶۱

(۹) الرسالۃ الجلالیۃ - تصوف کے موضوع پر رسالہ جو حضرت شاہیہ کے مرشد سید جلال الدین مخدوم جہانیاں کے نام معنون ہے (جمعات، جلد پنجم ص ۱۴۶)

(۱۰) جامع الطرق الرھانیۃ - حضرت شاہ عالم کو چودہ خانوادوں میں اجازت حاصل تھی۔ اس رسالہ میں ان تمام طریقوں کا بیان ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو اوراق پر مشتمل یہ مخطوطہ پیر محمد شاہ لائبریری، احمدآباد، میں محفوظ ہے

(۱۱) رسالہ اعتماد المریدین - حضرت شاہیہ کے مریدوں کے لئے ہدایت نامہ ہے (جمعات، جلد چہارم ص ۱۲)۔

(۱۲) مفاتیح خزائن اللہ - جس کا دوسرا نام فتح الذاکرین بھی ہے روزانہ کے اوراد پر مشتمل ہے ۸۵۱ ھ میں مرتب ہوا اور ۸۶۳ ھ میں عام افادے کے لئے شائع کیا گیا لطائف شاہیہ (ص ۱۱۶ تا ص ۱۳۰) میں پورا کا پورا نقل کرلیا گیا ہے [۱]

(۱۳) زینۃ المفاتیح - اوراد پر مشتمل ایک اور رسالہ جسے مفاتیح (مندرجہ بالا) سے پہلے پڑھا جاتا تھا۔ یہ بھی لطائف شاہیہ (ص ۸۱ تا ص ۹۳) میں محفوظ کرلیا گیا ہے [۲]

لطائف شاہیہ میں جو رسائل شامل کرلئے گئے ہیں۔ ان کا تو ڈاکٹر ترمذی مرحوم نے ذکر کیا ہے۔ لیکن جمعات شاہیہ جلد ہفتم کی شہادت کی بنا پر قرین قیاس یہ ہے کہ ان رسائل اور رسالہ نمبر ۱۰ کے علاوہ بقیہ سارے ہیں، تو اکثر رسائل جمعات شاہیہ جلد چہارم اور پنجم میں تمامہا محفوظ کردئے گئے ہونگے۔ خود

---

۱ لطیفہ نمبر ۴۰، زیر نظر مخطوطے کے جمعہ ۱۳ کی مجلس میں یہ ذکر ہے کہ نئے مریدوں کو اس کا ایک نسخہ عطا ہوتا تھا ایک نئے مرید نے پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ تو جواب ملا کہ یہ مناجات ہے (ورق ۶۱ ب)۔ ۲ لطیفہ نمبر ۲۹، حضرت مخدوم جہانیاں کے عرس (۸۷۷ ھ) کے موقع پر جامع کنوز محمدی کو حکم ملا کہ رسالہ زینۃ المفاتیح پڑھو خود حضرت شاہ عالم نے تواضع اور ادب کے ساتھ سنا اور رسالہ ختم ہونے پر فرمایا « شیخ فرید بسیار بہ ذوق وشوق می‌خواند » (ورق ۱۷۱ الف)۔ اس موقع کی خصوصیت کے پیش نظر یہ سعادت شیخ فرید کے حصے میں آئی، ورنہ دربار شاہیہ کے قاری خاص مولانا سلیمان بن علی تھے (ورق ۴۰ الف)۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس کی صراحت نہیں کی مگر انہوں نے ان رسائل کے محتویات کا جو مختصر سا ذکر کیا ہے اس سے ہمارے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ خود ان جلدوں کا مطالعہ کیا جائے کہ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

رسائل کے نام قابل غور ہیں عموماً یہ ائمہ اثنا عشر کے اسمائے گرامی پر ہیں یعنی ان کے نام معنون ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے شاہنواز خان صاحب مآثر الامراء کے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت شاہ عالم امامیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ «اثنا عشری» ہوتے ہوئے بھی «چار یاری» ہیں۔ الرسالہ فی مناقب الخلفاء الراشدین اس امر کی گواہی دے رہا ہے تو بات وہیں آکر ٹھہری جو راقم الحروف پہلے عرض کرچکا ہے یعنی حضرت شاہ عالم یقیناً سنی تھے مگر تولائی

الرسالۃ الکاظمیۃ جہاد اور مقاصد جہاد کے موضوع پر ہے «تیغ دار حضرت مقدسہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم» نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہوگا وہ یقیناً خصوصی توجہ کا طلب گار ہوگا۔ عام خیال یہ ہے (اور اس کے شواہد بھی موجود ہیں) کہ حضرات صوفیاء کرام جہاد بالسیف نہیں بلکہ جہاد بالنفس کے حامی رہے ہیں اور خود حضرت شاہ عالم عملاً کسی جہاد بالسیف میں شریک نہیں ہوئے۔ اس کی وضاحت یقیناً اس رسالے میں کی گئی ہوگی مگر افسوس کہ ڈاکٹر مرحوم نے اس رسالے کے بارے میں اپنے ماخذ کا ذکر نہیں فرمایا۔ بہرحال، جو کچھ انہوں نے رہنمائی کی خدا ان کو اس کے لئے جزائے خیر دے۔ برد اللہ مضجعہ

✻

ڈاکٹر شعیب اعظمی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

برنی اور اس کی تاریخ فیروز شاہی

تاریخ اور ادبیات کا رشتہ بہت گہرا ہے اور غالباً قدیم بھی تاریخ بھی ادبی اصناف کی مانند ایک مخصوص فن ہے اور اُسے دوسری اصناف کے مقابلہ میں بڑا مرتبہ حاصل ہے اور ہر عہد میں تاریخ اور مورخ کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ درباروں میں جہاں ایک طرف موسیقاروں، شعراء، مصوروں اور دوسرے ممتاز اہل فن کو بار ملتا رہا ہے وہیں مورخ کو اونچی مسند ملتی رہی ہے اور خصوصاً اسلامی عہد میں تو یہ فن اتنا پروان چڑھا کہ دوسرے علوم اس کی روشنی میں مدھم پڑ گئے چنانچہ تاریخ کی مستند کتابوں اور معروف مورخین کے ذکر سے صفحات بھرے پڑے ہیں جن سے نہ صرف سلاطین اور حکمرانوں کے نام زندہ ہیں بلکہ ان کے اچھے اور برے دونوں کارنامے ہمیشہ آئندہ والوں کے لئے بہت سبق آموز ہوئے ہیں کیونکہ مورخ کا قلم انتہائی دانشمندی کے ساتھ اُس عہد کے بیشتر واقعات اور اہم حادثات کو قلمبند کرتا چلا آیا ہے اور اسی کوشش میں وہ انجانے طور پر ادبیات کے دائرہ میں داخل ہوکر داستان نویسوں اور نظم نگاروں کی صف میں کھڑا ہوجاتا ہے وہ شاعر کی مانند بدیہہ گوئی، بذلہ سنجی اور علوم متداولہ سے کماحقہ بہرہ ور ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات مورخ، شاعر اور شاعر، مورخ بھی ہوتا ہے۔ وہ تاریخی مہمات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں کبھی اپنے کلام سے استناد بخشتا ہے اور تفسیر واحادیث کے موزوں اقتباس کے ساتھ ہی قدما یا ہمعصر شعراء کے کلام سے واقعہ کو موثر بناتا ہے اور عبارت کو مزین کرتا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے اور بسا اوقات ایک ہی عہد کے شاعر اور مورخ ایک دوسرے سے بے نیاز اپنے مخصوص میدان میں اپنا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں اور جب وہ قاری کی نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو اسے ایک طرف نثری پیرائے میں وہ سب کچھ نظر آتا ہے جو کسی شاعر کے کلیات یا کلام میں۔ ایک طرف نثر مسجع، مقفّی

اور انشاء پردازانہ اسلوب بیان یا نثر عاری کا نمونہ ہے تو دوسری جانب صنائع، بدایع اور قافیہ وردیف کے قالب میں اصناف سخن کا ڈھیر ملتا ہے

سلاطین دہلی میں تغلق خاندان نے تقریباً ۹۵ سال ۷۲۰ ھ - ۸۱۵ ھ ۱۳۲۰ء - ۱۴۱۲ء تک ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر حکمرانی کی روایتی طور پر ان سلاطین کے دربار بھی مورخین، شعراء، علما، فضلا اور فنون لطیفہ کے ماہرین سے پُر تھے جن کے دم سے ان کے مہمات، جنگیں، فتوحات اور کارنامے تاریخ اور شاعری کا جز بن چکے ہیں اگر غیاث الدین تغلق ۷۲۵ ھ/۱۳۲۴ء، محمد بن تغلق ۷۵۲ ھ/۱۳۵۰ء اور فیروز شاہ تغلق ۷۸۰ ھ/۱۳۷۷ء جاہ وجلال اور تخت وتاج کے مالک تھے تو دوسری طرف امیر خسرو، امیر حسن سجزی، بدر چاچ، عصامی اور مولانا مطہر کرہ آسمان شاعری کے چاند اور سورج تھے امیر حسن سجزی، حمید قلندر اور امیر خورد کی تصانیف فوائدالفواد، خیر المجالس، اور سیر الاولیاء عالم روحانی کے پیشواؤں حضرت نظام الدین اولیا اور نصیر الدین چراغ دہلی کے اردگرد منڈلانے والے لاکھوں پروانوں کے ذوق عبادت، عقیدت اور لائحہ عمل کی آئینہ داری کر رہی تھیں اور اگر اس دیوانے ذوق وشوق، حلقۂ قیل وقال اور محمل شعر وادب اور منصۂ تاریخ نگاری میں کوئی شخص تن تنہا کھڑا تھا تو وہ تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ضیاؤ الدین برنی ہے وہی برنی جو تاریخ نویسی کا ایسا اعلی اور ارفع مقام مقرر کرتا ہے کہ عام انسان تو اس بلندی تک دیکھنے کی جرات بھی نہیں کرسکتا ہے. تاریخ اُس کی نگاہ میں ایک مذہب اور شریعت تھی جہاں کم اصلوں، سفلوں اور ارذال کا گذر ممکن نہ تھا جو صرف خاندانی علما، باوقار افراد اور دیدہ ور اشخاص ہی کا حصہ تھی اور یہ وہی برنی تھا جو اعلی نسبی کے بلند بانگ دعووں اور اسلاف سے نسبت کا واسطہ دے کر ہمشکل محمد بن تغلق کا ندیم بنا، جو اپنی عیاشانہ زندگی کا ذکر کر کے آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہے. جو اس نے معز الدین کیقباد کے رنگین عہد حکومت میں گذاری تھی برنی جس نے امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کے درمیان دوستی اور ملاقات کرا کے دونوں گھروں میں آمدورفت شروع کرائی تھی اور جو اپنی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی اور بدیہہ گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور اس عہد کے روحانی قطب

نظام الدین اولیا کا نہ صرف مرید تھا بلکہ انہیں کی خانقاہ کے خطیرہ میں اس حالت میں مرا کہ میت پر ایک ٹاٹ کے ایک ٹکڑے کے علاوہ ڈھکنے کے لئے کوئی دوسری چیز میسر نہیں آسکی «مراۃ الاسرار» کے مصنف برنی کے بارے یوں لکھتے ہیں -

«بخدمت سلطان المشایخ او را قرب تمام بود اکثر سوالات غامض کردی وجوابهائی باراحت شنیدی و از کمال اخلاص مخص بخاطر جمعیت آنحضرت در غیاثپور ساکن شد وتمام عمر ہمانجا گذرانید وروز بروز مہربانی سلطان المشایخ در حق او زیاد بود »[1]

برنی کو غالباً اسی حلقۂ شیخ میں امیر حسن اور امیر خسرو سے تودد اور یگانگت میسر آئی اور فارسی دنیا کے نثر ونظم اور تاریخ کے ان ارکان ثلاثہ کے بارہ میں جس میں وہ خود شامل تھا، اس طرح لکھتا ہے :-

«وسالها مرا باامیر خسرو وامیر حسن مذکور تودد ویگانگی بوده است وبه ایشان به صحبت من نتوانستندی ومن نتوانستمی که مجالست ایشان را گـــذرانم وار محبت من میان ایشان ہر دو اُستاد قرابتی شده در جانہائی یک دگر آمد وشد کردن گرفتند »[2]

برنی نے اپنے گذشتہ ایام کی تصویر کشی بھی بڑی انشا پردازانہ عبارت اور شاعرانہ انداز میں کی ہے کاش اس کا «حسرت نامہ» دستیاب ہوجاتا تو تاریخ فیروز شاہی کے مقابلہ میں یہ کتاب اُس کا شعری کارنامہ ہوتی۔ وہ اپنی حسرتوں، بے بسی اور زمانہ کی ناسازگاری کا شکوہ ان الفاظ میں کرتا ہے -

«خوابها ار سر یاد می‌آید ومجلسها وعیشهائی گـذشته که درمیان عالی همتان بزرگ منشان گذرانیده‌ام ودر مجلس من خوبرویان وخوب طلنان وطربهان بی‌دل وخوبرویان طـاق وگلعذاران سیمین سـاق وساقیان سرو قـد وامردان شکرلبان ومطربان مستشی وغزلخوانان عتار بسیار بودند

---

۱ عبدالرحمان چشتی، نسخه خطی، جلد اول، مملوکہ دار المصنفین، اعظم گڈھ، ص ۴۵۵

۲ تاریخ فیروز شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، کلکتہ ص ۲۵۵

دلم می‌خلد امروز چه از قحط طوایف مذکور چه از بی‌سیمی کنج
محنت وگوشه مذلت خوار وزار وبی‌مقدار وبی‌خریدار مانده‌ام چه کنم »[1]

اس کے اس بے یار ومددگار وقت کا حال بہتوں نے لکھا ہے۔ مگر «تذکرہ علمائی ہند» کے مصنف رحمان علی کا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔

«وی مردانه وعاشقانه بدار بقا آن زمان رفت که بوقت نقل دانی ودرمی برخود نداشت بلکه جامها بر تن نیز نه بود اثر صحبت سلطان المشایخ بر صحبت بادشاه غالب آمد مثل فقیر ومساکین جان بداد ودر جوار حظیره سلطان المشایخ در پایان والد بزرگوار خویش مدفون گشت.»[2]

کیسی عبرت کا مقام ہے کہ جس شخص نے سلطان محمد بن تغلق کے بارہ میں یہ معروف کلمہ «نامرادانہ زیست» کو تاریخ کا ایک مقولہ بنا دیا وہی شخص خود نامراد اور بے یار ومددگار مرا اور اپنا مرثیہ خود اپنے قلم سے اس طرح لکھ گیا۔

نه کافرم نه مسلمان نه دل بدست نه دینم	خدائی دل بر من دارد آگهی که چنینم
نه راسخم نامیدی نه واثقم بنجاتی	هزار جانی خلل یافتست راه یقینم
کجا روم چه بکنم حال خویشتن به که گویم	نه پائی رفتن دارم نه روئی آن که نشینم
مثال سینه موزست شرق وغرب جهانم	بسان حلقه نمگست آسمان وزمینم
مگر خدائی کشاید درمی ز رحمت خویشم	که سخت عاجز وبیچاره وعمین وحزینم[3]

غرض اسی برنی کی تاریخ فیروز شاہی تغلق دور کی ایک تاریخی، معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی اور علمی دستاویز ہے مگر آج کے چند محققین اُس کی اس تصنیف کو غیرمستند قرار دیتے ہیں ایسی تاریخ وادب سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص کو یہ باتیں اس وقت درست جاننا چاہیئیں جب اسی عہد کے دوسرے فضلا کے نثری آثار، صوفیا کے ملفوظات اور شعراء کے منظومے ان بیانات کی نفی کرتے ہوں اور سرے سے وہ سب کچھ پیش ہی نہیں آیا ہو جو کچھ تاریخ فیروز شاہی

۱ تاریخ فیروز شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، کلکتہ، ص ۱۶۵
۲ تذکرہ علمائی ہند، رحمان علی خان، ص ۹۷
۳ تاریخ فیروز شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، کلکتہ، ص ۳۶۹

میں بیان ہوا ہے

اس سلسلے میں زیادہ تر شواہد ان منظوم آثار سے تلاش کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوا ہے جو درباروں کے بالمقابل صوفیا کی خانقاہیں تھیں اور درباری مورخین کی مانند یہاں کے معتقد مریدین اپنے مرشدین کے فرمودات محفوظ کرلیا کرتے تھے علاوہ ازیں وہ شعراء بھی تھے جو مثنویوں، قصاید، غزلیات، ترکیب اور ترجیع بندوں میں تلمیح، استعارہ، کنایہ اور تشبیہات کے پیرائے میں بہت کچھ کہدیا کرتے تھے۔ برنی نے اولین تغلق بادشاہ غیاث الدین ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ع کے بارہ میں لکھا ہے کہ جب وہ ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ع میں دہلی کے تخت پر متمکن ہوا تو اس کے پانچ سالہ عہد سلطنت میں امن وامان اور عدل وانصاف لوٹ آیا

«سلطان تغلق شاہ در قسم رعیت پروری گوئی سبقت از رعیت پروردن سلف ربودہ بود کہ اگر چند سال برتخت شاہی متمکن ماندی وقصائی اجل آن بادشاہ رعیت پرور آن را بہ ربودی »[1]

برنی کے ہمعصر اور مشہور شاعر عصامی فردوسی ہند نے اپنے شاہنامے «فتوح السلاطین» میں غیاثی عہد کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ برنی کے بیان کی تصدیق کرتا ہے -

زمانہ بساط ستم در نوشت	ہمہ لشکر ظلم مقہور گشت
ثنا خوان شہ گشت ہر خاص وعام	دعا گویش آمد جہان صبح وشام
بہ ہجرت یقین ہفتصد وبست بود	کہ این خرمی در جہان رو نمود
چو بگرفت ملک غیاثی قرار	رفتہ تہی گشت شہر ودیار
دگر سکہ زد گردش روزگار	چنان کرد مہری دگر آشکار[2]

غیاث الدین تغلق کی دوسری خصوصیات کا تذکرہ خود امیر خسرو کے «تغلق نامہ» میں بھی ملتا ہے۔ اس وقت امیر خسرو چراغ سحری تھے اور بادشاہ وقت کی مدح میں جو کچھ وہ منظوم کرگئے ہیں وہ برنی اور عصامی دونوں کے

---

۱ تاریخ فیروز شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، کلکتہ، ص ۴۴۲
۲ فتوح السلاطین، عصامی، ص ۳۸۲

نثری اور شعری بیان کی تصدیق کرتا ہے۔

اگرچه این تحفه‌ای در خور شاه است　　که این ره نی سزای این کلاه است
ولیکن پیش سلطان فقیری　　گلیمی هدیه سازد نی حریری
تو بپذیری زمن این پر ره چند　　پذیر دار تو هم گیتی خداوند
به هر گه در رکوع و در سجودم　　دعائی پادشه ذکر و درودم
چو در سلک آرم این دریائی شهوار　　پسند شاه عالم خواهمش بار
که گفتارش چه سهل و دلپسند است　　گرش سلطان پسندد ارجمند است[1]

عصامی، محمد بن تغلق سے سخت ناراض تھا۔ اس کو محمد بن تغلق سے بڑی تکلیفیں پہونچی تھیں اور بادل ناخواستہ دہلی سے دولت آباد ۷۳۷ھ ۱۳۳۶ء جانا پڑا تھا۔ سلطان نے جس طرح تاج وتخت پایا اور جس کر و فر سے سلطنت دہلی کے تخت پر ۷۵۲ھ/ ۱۳۵۱ء میں جلوس کیا وہ شاعر کی نگاہ میں ہیچ تھا کیونکہ وہ باپ کا قاتل تھا، ظالم تھا اور جھوٹا ماتم کر رہا تھا۔ پھر بھی اس کی خوبیوں کا ذکر کر ہی گیا ۔

چو شهزاده با همایون پسر　　نشد فارغ از دفن خاک پدر
بظاهر یکی ماتمی ساز کرد　　بباطن یکی عشرت آغاز کرد
سه روزی بناموس ماتم نشست　　دگر روز ناموس ماتم شکست[2]
دواجی بپوشید و تاجی نهاد　　بصد عیش بر تخت زربار داد
بحکم خدا کیست شهریار　　شده بوالمجاهد در آن روزگار
محمد شهش خواند خیل و سپاه　　که دیدند فرقش سزائی کلاه
خطاب قدیمش به هندوستان　　بخوانند خوبان هندی زبان
زتاریخ بد هفصد و بست و چار　　که بر تخت بنشست آن شهریار[3]

ضیاء الدین برنی نے اس تخت نشینی کا ذکر مداحانہ اور شاعرانہ نثر میں کیا ہے۔ اگر ہم عصامی کے اشعار کو بھی معتبر نہ سمجھیں تو ہمیں درباری شاعر بدر چاچ کے متعدد قصائد میں «ابو المجاہد جم شاہ بن محمد شاہ» کے جیسے القاب

۱ تغلق نامہ، امیر خسرو، ص ۱۲　　۲ فتوح السلاطین، عصامی، ص ۲۰۸
۳ فتوح السلاطین، عصامی، ص ۲۶۹

وخطابات کے متعدد نمونے مل جائیں گے۔ اور اسی لئے برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی عبارت قابل توجہ ہے -

«سلطان محمد جہان بخش با کوکبہ ودبدبۂ محمودی وسنجری در دروازہ بداؤں در آمد ودر دولت خانہ نزول فرمود وباامرا واکابر پیلان سوار شد، وتشتہا پر از تنگہا، زر ونقرہ پیش خود نہادہ وتشت در کوچہا وبازارہا می ریختند وتشتہا پر می کردند ودربامہا ودر کوچہا باران تنگہ زر ونقرہ می باریدند وعامۂ خلائق از زن ومرد وبزرگ وجوان وپیر وغلام وکنیزک ومسلمانان وہند وسلطان محمد را ببانگ بلند دعا می کردند وثنا می گفتند ودہلی گلستان شدہ بود وگلہائے زرد وسفید ولال بر خلق گل ریزی می شد واز آن نثار بادشاہ کہ در ہیچ عصر ہیچ بادشاہی مشاہدہ نبود طلاب احتساب ومحتاجان بریدہ می شد ودر ہر خانہ از شادی در آمد وآواز دف ودھولک بر می آورد ودر ہر نواح وہر دہ مردان وزنان سرودہا می گفتند »[1]

محمد بن تغلق بڑا حوصلہ مند، پرجوش اور عزم وارادہ کا بادشاہ تھا۔ اُس کا علم، اُس کے منصوبے، رواداری، مذہبی رجحان، سخاوت، دریا دلی، شقاوت اور ستم کشی کی صدہا داستانیں اس عہد کے آثار سے ہویدا ہیں علما وفضلا کے ساتھ بحث ومباحثہ ہو رہا ہے نجم الدین شاعر اور عبید شاعر کے ساتھ منطقی مسائل حل ہو رہے ہیں رمضان کے روزے سیکڑوں علما اور مشائخ کے ساتھ افطار کھولے جارہے ہیں بغداد سے خلیفۂ وقت کے علم اور فرامین معہ خلعت اور چتر آرہے ہیں شہر کو آراستہ کر کے علماء کو ان کے استقبال کے لئے بھیجا جارہا ہے۔ خود ننگے پاؤں عقیدتمندانہ طور پر تبرکات لانے والے فرد کے گھوڑے کے پیرون کو بوسہ دیا جارہا ہے اور شہزادہ دمشقی اور رجب برقعی جیسے عباسی دربار کے معمولی خدام کو دہلی خاص میں محلات، زمینیں اور جائدادیں عطا ہورہی ہیں۔ چنانچہ مورخین نے اسے جنون اور خبطی تک کہہ ڈالا ہے برنی تو بڑی چابکدستی کے ساتھ اُس کے معائب کو محاسن میں شمار کر گیا ہے۔ اُسے سلیمان بادشاہ جن

---

۱ تاریخ فیروز شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، کلکتہ، ص ۴۶۸

وانس کہا ہے اور سخاوت میں تو حاتم کو بھی کسی شمار وقطار میں نہیں رکھا ہے :-

« سخاوتی داشت که گنج درویش دادی وآن را حقیر پنداشتی ۔ به بخشش مدة العمر هزاران حاتم کمترین عطائی یک روزه او بودی ۔ به هنگام بذل وایثار غنی وفقیر آشنا وبیگانه در نظر همیش یکسان نمودی و در پادشاهی او من اولی الی آخره عطما وکبرا وپروران وکشتی شکستگان بامید عواطف مراحم او از عراق وخراسان وماوراءالنهر وترکستان وروم وعربستان رو به هندوستان می‌آوردند واز آنچه تصور کرده بودند نوازش‌ها می‌یافتند »[1]

برنی کے اس بیان کی تصدیق عصامی کے ان چند اشعار کے اقتباس سے ہوجاتی ہے اگرچہ عناد اور دشمنی وہ سب کچھ کہنے نہیں دیتی جو برنی کہہ گیا ہے ۔ عصامی کہتا ہے -

همه عدل واحسان در آغاز کار عیان کرد در شهر آن شهریار
در آن بارگه آنچنان زر فشاند که مهر از زر افشانیش خیره ماند
بیاسوده خلقی زاحسان او همه آفرین کرده بر جان او[2]

محمد بن تغلق نے اسلام کی عقیدت میں اپنے رائج الوقت سکوں پر خلیفہ کا نام کھدوایا ۔ حاجی رجب برقعی ، حاجی سعید ساماني اور شیخ الشیوخ مصری کا شاہانہ استقبال کیا تو برنی نے اس طرح لکھا -

« حاجی رجب برقعی شیخ الشیوخ مصری بامنشور نیابت خلافت باسم سلطان محمد خلعت خاص امیر المومنین از مصر آورده بودند ۔ استقبال کرد از دور پیاده شد وپیش ایشان رفت وچندان تعظیم کرد که نظارگیان را حیرت بار می‌آورد »[3]

بدر چاچ ملقب به فخرالزمان محمد بن تغلق کا درباری شاعر تھا ۔ وہ تقریباً ۷

---

۱ تاریخ فیروز شاہی ، ایشیاٹک سوسائٹی ، بنگال ، کلکتہ ، ص ۴۰۸
۲ فتوح السلاطین ، عصامی ، ص ۴۰۹
۳ تاریخ فیروز شاہی ، ایشیاٹک سوسائٹی ، بنگال ، کلکتہ ، ص ۴۹۵

برس یعنی ۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء سے ۷۴۵ھ ۱۳۴۴ء تک دربار میں رہا اور اس درمیان حتبی بار بغداد اور مصر سے خلعت اور فرمان آیا ہے اُس کا ذکر اپنے قصائد میں کرتا گیا ہے بربی کے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق میں بدر چاچ کے قصیدے پیش کئے جارہے ہیں -

وزیر ملت شه را حضرت این مرحمت شد	که بر منشور بحر و بر جاری باد اقلامش
دبیر خاص حضر دوار واب این خطاب آمد	که زلف عارض مه باد تحریرات ارقامش
برای مطمع خانش امام الملک تعیین کرد	که بهتر هر دو عالم باد ربع عشر انعامش
امیر المومنین فرمود تا بر جمعه بر منبر	بهفت اقلیم میخواند شاہنشاہ اسلامش
باستقبال فرمانی که از پیش امام آمد	برهنه پائی سر کرده چو ایمان شد راسلامش
خلایق پیش و پس پویان ملایک ذکر حق گویان	زحرع شهه شده علطان گهر بر مقره حامش[1]

محمد بن تغلق مذہبی معاملہ میں ایک طرف تو اس قدر خاکسار تھا مگر دوسری جانب سیکڑوں علما اور مشائخ اس کے ظلم وستم سے تنگ آگئے تھے . مولانا قطب الدین منور اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی تو باقاعدہ دربار میں بلائے گئے اور ان کے ساتھ نازیبا سلوک کیا گیا ، بہتوں کو تہ تیغ کیا گیا ، زنداں میں ڈالا گیا اور لوہے کے پنجرے میں بند کرکے تشہیر کرائی گئی اور بعضوں کے منہ میں زبردستی غلاظت ڈالی گئی مولانا شمس الدین یحیٰی اور عفیف الدین کاشانی کا حشر قابل عبرت تھا محمد بن تغلق کے اس متضاد کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے برنی لکھتا ہے .-

«من که مولف تاریخ فیروز شاہی ام در اوصاف متضاده سلطان حیران وسراسیمه می مانم واز طریق اوصاف ربوبیت وصفات بندگی در ہیچ طرف مرا یقین حاصل نمی شود سلطان محمد در حق خلفاء عباس چندان میت اندوچه آنانان که بصدر حیات از قرابت ایشان وبخدمت او رسیده تواضعها کند وباایں چناں کمالات اعتقادی که آثار وعبارات آں برای العین مشاہده کردم ومی دیدم که ہیچ روزی نمیگذشت که مسلمانان سنی را ہمچو ترب وتره سر نمی زند وخونی جوی مسلمانان در پیش خود نمی راند ودیوان سیاست وحمه کردن جاری بود »[2]

۱ قصائد بدر چاچ ، بدر چاچ ، ص ۱۴ ۲ تاریخ فیروز شاہی ، ص ۴۹۷

عصامی نے تغلق کی اس روش پر اسے ضحاک اور شیطان سے تشبیہ دی ہے اور شعری پیرایہ میں جس قدر ممکن تھا اسے ملعون کیا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھنے کے قابل ہیں:۔

ولیکن عجب بین که دوران ما　　که دارد رہی طرفه سلطان ما
نه شیطان در او را مسلم شده　　نه اندر کتفهاش ماری زده
نه او را بفرمود کس در جهان　　علاجی رمغز سر مردمان
نه چو دین ضحاک شد دین او　　چرا شد فزون کیش از کین او
بر آن ظالم کو کرد سالی هزار　　ازین گشت در یک زمان آشکار
بتعلیم شیطان گران نابکار　　بکشتند دو مردم در آن روزگار
نگه کن که بی علتی شاه ما　　هزاری کشد هر زمان از جفا
گر او خون رونباش نابل بریخت　　ازین حمله اوتاد عالم گریخت[1]

محمد تغلق کے عہد کے کچھ اور دیگر واقعات تاریخی حقیقت ہیں اور برنی کے علاوہ دوسرے مورخین نے بعد میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ہر واقعہ کی تصدیق عصامی کے کلام سے ہوجاتی ہے۔ ۲۶-۷۲۷ھ ۱۳۲۶ع میں سلطان کے حکم سے دولت آباد یعنی دیوگیر کو دوسرا پایتخت بنایا گیا۔ عوام، خواص، علماء، فضلا، شعرا کے علاوہ خود سلطان کی والدہ مخدومہ جہان وہاں زبردستی منتقل کئے گئے۔ امیر حسن سجزی نادل ناخواستہ روانہ ہوئے۔ اس افرانفری اور پریشان حالی کا قصہ مبالغہ آمیز حد تک بیان کیا گیا ہے اور کتے بلی تک کو دہلی نکالا ملا ہے۔ عصامی کے اشعار پڑھئے اور اس دردناک قیامت صغری کا تصور فرمائیے۔

همه خلق گریان پی خانه خویش　　رہا کرد مالوف او طبان خویش
زنانی که بودند اندر حجاب　　ندیده سرور رخ آفتاب
ندیده در خانه خود کهی　　ندانند از صفحه تا در رہی
بسی گوشه گیران پرہیزگار　　بسی کنج شیان شجه گذار
عوانان تکلیف و تعذیبشان　　برون کردند از جاها موکشان
رہیم عوانان بردن آمدند　　همه خیمه از شهر بیرون زدند
مزاوی همی شد بهر منزلی　　بوده است حسر مرده در منزلی[2]

---

۱ فتوح السلاطین، ص ۴۰۲　　۲ فتوح السلاطین، ص ۴۰۴

حکومت کی جانب سے پختہ سڑکیں بنوائی گئیں راستے میں سواری کا انتظام تھا اور ہر قسم کی سہولت فراہم کی گئی تھی مگر بوڑھے ، بچے ، عورتیں زار وبزار ، حیران وپریشان ، صحرا صحرا تپتی دھوپ ، دھول اڑتی ہوئی فضا میں بھوکے پیاسے جان دے رہے تھے اور لاکھوں کے اس قافلہ میں بمشکل دسواں حصہ دولت آباد پہونچ سکا تھا -

چه پیر و چه کودک چه مرد و چه زن — رہا کرد ہر یک دیار و دمن
بسی ساربین داد جان ناگدار — چو حجاج مانده بسراه حجار
بسی طفل بی شیر گشته ہلاک — بسی بسر پی آب خفته بخاک
ہمه مارکانی که ہرگز بخواب — نخورده غم از گرمی آفتاب
یکی جامه کهنه پیچیده پائی — ہمی کرد سجده بگامی دو جائی
یکی پا برہنه رہی می نوشت — ہمه دشت از ایشان صنم خانه گشت
زدئی که جز داغ صندل نبود — شد از کوش گرد زرد وکبود
بچشمی که جز در گلستان نرفت — بہاموں سرفت و بیابان سرفت
از آں قافله با عذابی شدید — سوئی دولت آباد عشری رسید[1]

۷۳۰ھ/۱۳۲۹ع میں تانبے کے سکوں کی تبدیلی کا انوکھا فرمان جاری ہوگیا بعض مورخین کے بقول دہلی کے پاس تانبے کا پہاڑ بن گیا اور ہر گھر سکہ ڈھالنے کا کارخانہ بن گیا زردار اور بےمایہ سب برابر ہوگئے اور تین سال کے اندر سونا تانبا ، مٹی ، لوہا اور چمڑا سب برابر ہوگئے ۔ عصامی نے اس موقع پر اپنے تاثرات کو اشعار کا جامہ اسی طرح پہنایا ہے :-

بفرمود شاه عرب سیر — بجاری که تعویض ہر سیم وزر
سراسر ہمه آہن و چرم ہم — سپارد بنه اہل سرائی درم
بداں تا زسر سکہا نو زنند — ہمه مہر بر آہن دمس کنند
عرض چوچنیں سکه زد شہریار — یکی فتنه پیدا شداند و دیار
ہمه خلق از بیم آں بد گہر — ہمی می خریدند بروزن زر[2]

---

۱ فتوح السلاطین ، ص ۴۰۳ ۲ فتوح السلاطین ، ص ۴۲۲

بہر جایکی طشت د کمش تبر — شدہ آنچہ سیم و دینار ورر
چو دران مہر ناخوش بر آمد سہ سال — ہمہ خاک شد ہر کجا بود مال
یکی روز فرمود آن زر پرست — کہ کس مہر مس را نگیرد بدست
ہمہ خاک حاصل شدہ از زری — چو از قلب اکسیر خاکستری
تہی دست شد مرد سرمایہ دار — بکشور چنین ظلم شد آشکار[1]

محمد بن تغلق کی مہمات میں ایک ہمالیائی غلطی قراچل کی پہاڑیوں پر حملہ تھا۔ نہ جانے تغلق کے دماغ میں یہ بات کیسے آئی؟ ملک میں خود بغاوتوں کا طوفان برپا تھا۔ دوآبے میں ٹیکس کی زیادتی سخت قحط اور آبادی کا فرار شمال ہند میں اضطراب کا سبب تھے۔ چنانچہ جب سلطان نے برنی کو مشورہ کے لیے بلا کر کہا کہ "ملک ما مریض گشت" جب بخار کا علاج کرتا ہوں تو قبض ہوجاتا ہے اور اس کا ازالہ کرتا ہوں تو دوسری تکلیف شروع ہوجاتی ہے" برنی سے پوچھتا ہے کہ تم تو مورخ ہو بتاؤ کہ گذشتہ مورخین اور سلاطین ماضیہ نے ایسے حالات میں کیا کیا ہے؟ یہ سب کچھ تھا اور قراچل پر حملہ یوں ہو رہا ہے ایک لاکھ کی فوج نامور سپہ سالار کی سرداری میں روانہ کی گئی اور ناریخی ہزیمت اٹھانی پڑی اور تاریخی رکارڈ کے مطابق چند مٹھی بھر فوجیوں کے صحیح سلامت لوٹنے کے علاوہ بقیہ سب جاں بحق ہوئے عصامی کے اشعار ملاحظ ہوں:۔

شنیدم کہ خسرو در آں روزگار — برو نامزد کرد یک لک سوار
چو خسرد ملک در قراچل رسید — زفرماں بسمل گریزی ندید
بفرمود تالشکر از ہر طرف — در آید بہ پیغولیا صف بہ صف
پس آں گاہ نام آوراں حشم — کہ بودند چوں اژدہائی دژم
یکی خونی آبی ہمہ کوہ دید — کہ گردش مغیلان انبوہ دید
طلسمی عجب در دہانش نہاں — بکردہ حکیماں ہندوستاں
سر چشمہ او کلیدی عجب — گردہی برو نامزد روز وشب
چو بگذشت لشکر از آں جوبار — در افتادہ در غار ودر کوہسار
رہی داد ہندو سپہ را بکوہ — رہا کرد آیند گردھا گردہ[2]

---

۱ فتوح السلاطین، ص ۴۲۲ ۲ فتوح السلاطین، ص ۴۲۳

چو اُفتاد لشکر بہ ہر کوہ وغار — بجوشید ہندو ازاں کوہسار
بہر قلب راہی گرفتند راہ — نہ بستند ہر سو رہی در سپاہ
شنیدم گران چند یک لک سوار — برون آمدہ پنج یا شش ہزار[1]

برنی صرف ندیمی کا شرف حاصل کرسکا تھا امیدیں تو بڑی باندھ رکھی تھیں مگر نہ تو عہدہ ہی ملا تھا اور نہ جائداد وملکیت بلکہ جیل کی کال کوٹھری دیکھیں اور عہد فیروزی میں حاسدوں نے دربار تک میں رسائی نہ ہونے دی ۔ ان سب کے باوجود اُس نے تعلق سلطنت کی مورخانہ مداحی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اُس کے تمام بیانات کی تصدیق امیر خسرو ، بدر چاچ ، عصامی اور مولانا کڑہ کے منظوم ناموں سے ہوجاتی ہے اور اُس کی تفصیل کسی اور موقع کی متقاضی ہے

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں سلاطین، امرا اور ملوک کے ذکر کے علاوہ روحانی دنیا کے حکمرانوں اور مشائخ کا ذکر بھی کیا گیا ہے خاص طور سے اس عہد کے مقبول شیخ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ اور اس کے دائرہ کے مشاہیر حلقا ، مریدین ، عبادات ، مجاہدات ، بحث ومباحث ، قیل وقال ، اوراد ووظائف اور سماع جیسی مخصوص چیزوں بزرگوں کے مزاروں پر منائے جانے والے سالانہ عرسوں کا مفصل بیان بھی ملتا ہے ۔ غیاثپور میں حضرت نظام الدین اولیا کے جماعتخانہ اور حلقہ مریدین ہی میں نہیں بلکہ شہر کے گھر گھر میں تلاوت اور وظیفہ خوانی کا رواج ہوگیا تھا وضو خانے اور حوض پانی سے بھرے رہتے ۔ مٹی کے لوٹے ، صفیں ترتیب وار رکھے ہوتے اور چھپروں میں حفاظ تلاوت میں مصروف رہتے اکثر مریدین شب وروز اس جستجو میں رہتے کہ شیخ چاشت ، اشراق ، تہجد ، قیام اللیل اور اوابین اور نوافل میں کتنی رکعتیں اور کتنی اور کونسی دعائیں پڑھتے ہیں عصامی نے حضرت نظام الدین اولیا کی محبوب خلائق شخصیت اور ان کے اوصاف واثرات کے متعلق جو منظومہ یادگار چھوڑا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے -

شنیدم ز پیران اختر سعید — کہ چون وقت ابدال دہلی رسید
نظام الحق آں پیر ثابت قدم — ملا ز ملوک پناہ امم[2]

---

۱ فتوح السلاطین ، ص ۴۲۳ ۲ فتوح السلاطین ، ص ۴۳۸

محمد کہ شد خاتم اولیاء　　چو ختم ہمہ انبیا مصطفیٰ
زخاک درش خسروان تاجدار　　سرخا بداش شدہ خاردار
بر او رنگ ناید وسر در صفا　　بصد گونہ خورد از زمانہ قفا
سلاطین بر ایوان او بار خواہ　　بر ایوان او سودہ خانان جباہ
بدرگاہ آن شاہ ملک سلوک　　بچونک زبی گشتہ واصی ملوک
چہ گوید کسی وصف آن آستان　　چہ داند زمین درجہ آسمان
ندائد کسی قدر او جز خدائی　　بود آگہ از رہنما رہنمائی
خدا را یکی بود از دوستان　　مقرر بدو ملک ہندوستان[1]

جب دوسرا دارالسلطنت دولت آباد بنا تو عوام وخواص کے ساتھ صوفیا بھی وہاں گئے اور مرجع خلائق رہے شیخ زین الحق والدین کی موجودگی لوگوں کی نجات کا باعث تھی اور وہاں کے مصائب میں قحط کی آفت ناقابل بیان تھی بزمی نے اس تاریخچــــی قحط کا بھی ذکر کیا ہے اور بزمی کا خیال ہے کہ عوام کو اس آفت آسمانی سے جو نجات ملی وہ شیخ کے وجود کے طفیل تھی۔

بہ آخر چو دور شقاوت گذشت　　یکی مرد معنی پدیدار گشت
زمان را زدست ستم وارہید　　زمین را زگرداب محنت کشید
لقب زین دین گشتہ آن مرد را　　کہ مقبول کونین کردش خدا
بہ علم وعمل دانش آراستہ　　زدنیا وعقبی دمش خاستہ
زخلقش جہان گشتہ باغ بہشت　　زبویش شدہ تازہ گلزار چشت
ہمراہ وفا ہمسر بویزید　　بمرم صفا ہمدم بو سعید
طفیل ہمان مرد روشن ضمیر　　برستہ ہمہ کشور دیوگیر
عرض در پناہ ہمان مرد راہ　　برستی بر و بوم از ظلم شاہ[2]

دیوگیر دولت آباد ہوگیا تھا اور سلسلہ چشت کے دوسرے بزرگ برہان الدین غریب کا وجود بھی ظلم انسانی اور آفت آسمانی سے پناہ وعافیت کا باعث تھا۔ امن اور سلامتی کے اس ضامن کا حال عصامی کے اشعار میں دیکھئے۔

---

۱ فتوح السلاطین، ص ۴۲۸　　۲ فتوح السلاطین، ص ۴۴

سکوت ورو کرد صاحبدلی | کہ شد خادمش ہر کجا مقبلی
گرفتہ ز اسرار کامل نصیب | بہر وصف در ملک عالم غریب
ملک خواند برہان وبیش لقب | ملک ماند گرد ورش روز وشب
شدہ نام او حجت اہل دین | نشان گشتہ راز اہل یقین
چراغ صفا رویش افروختہ | دلش کاروان ریا سوختہ
شب وروز اوتاد وابدال ہم | مصاحب بر آن مرد ثابت قدم
ہمہ دولت آباد از باغ وراغ | پس از بہتش گشتہ دار الفراغ
ملک خانہ گشتہ ہمہ دیو گیر | باقبال آن مرد روشن ضمیر[1]

برنی نے سہروردی صوفی حضرت رکن الدین ملتانی کا ذکر بھی کیا ہے ۔ سندھ، اوچھ، ملتان میں بندگان خدا اُنھیں کی پناہ میں آسودہ تھے اور سلطان محمد بن تغلق اُن کا احترام اس حد تک کرتا تھا کہ جب اُس نے ملتان میں قتل عام کا حکم دیا تو شیخ ملتانی کے علاوہ اس تک شفاعت کے لئے کوئی اور کامیاب نہ ہوسکا عصامی کے اشعار دیکھئے :-

ابو الفتح شیخ زمان رکن دین | مگر بدور آن ہفتہ خزلت گزین
چو بشنید در شہر طوفان خون | برہنہ سر وپائی آمد برون
کشادہ زبان شفاعت گری | ہمی گفت شاہا جہان پروری
بسی خون بشاندی دریں بوم وبر | زتیغت گرفتہ جہان خون تر
بر اہل گنہ نزد اہل صفا | پسندیدہ تر است عفو از جفا
کنون دست دار از سیاست گری | چو شد نوبت عفو رحم آوری
چو بشنید آں راہ آفاق گیر | شد از شیخ مشفق شفاعت پذیر[2]

برنی نے دہلی کے محلات، مساجد، قلعے، باغات، مدارس، خانقاہوں، بازاروں اور سبزہ زاروں کی عظمت، تقدیس، رفعت، شوکت، کثرت، ازدہام، رونق اور نکہت کا مفصل ذکر تو کیا ہی ہے فصلوں، اناج، اجناس غلہ، پھولوں اور پھلوں کی اقسام کا ذکر بھی نہیں بھولا ہے شہر چار دانگ عالم میں مشہور تھا وسط ایشیا کے

---

۱ فتوح السلاطین، ص ۴۷۸ ۲ فتوح السلاطین، ص ۴۷۹

شہزادگان تو الگ رہے علما، فضلا اور شعرا کے کارواں در کارواں کھنچے چلے آرہے تھے۔ بدر چاچ اور مطہر کڑہ کے قصائد میں دہلی کی عمارتیں، قلعے، مساجد کی شان، شہر کی آرائش اور زیبائش کا جستہ جستہ ذکر ملتا ہے مگر عصامی نے شہر دہلی کی مجموعی خوبیوں کو جس طرح اپنے اشعار میں مقید کرلیا ہے وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آسکا ہے۔ مساجد، مقابر، مدارس، عالموں، مفتیوں اور صنعت کاروں نے دہلی کو بغداد، سمرقند اور بخارا سے زیادہ اہم بنا دیا تھا

چنان تختگاہی که در روزگار — نماند از شہان جہان روزگار
ملایک ہمه کوچہایش مدام — ز پرہای خود رفته بر صبح وشام
درو مسجدی ہمچو بیت الکرام — سر آورده خسروان عظام
مناره در آن مسجد باصفا — فردوس چون سدرة المنتہی
ہمان حوض شمسی ز پاکی آب — نبرد آب از چشمه آفتاب
نه بر چہار فصلش ہوا معتدل — شدار رو نقش‌ہا از رضوان خجل
باطراف او باغہائی سمن — چو پرچین بگردد سواد چمن
کسی کو در آن شہر گردد مقیم — نماند درو حرص باغ نعیم
از آن شہر عالم بسی خاسته — ہمه در ہمه علم آراسته
اگر مشکلی در بخارا فتاد — وگرچند در سمرقند زاد
گروہی که مفتی آن کشورند — ز اصحاب این شہر فتوی برند
در آن شہر ہر جنس صنعتگران — ہمه کامل از صنعت دیگران[1]

تاریخ فیروز شاہی ۷۵۸ھ/۱۳۵۶ء میں اور فتوح السلاطین ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء میں تغلق عہد کے نثری اور شعری ادبیات کا امتیازی کارنامہ ہیں۔ برنی نے یہ کام دہلی میں رہ کر کیا۔ دربار میں ندیمی کچھ دنوں کی چیز تھی اُس کی معنوی یادگار ہی اُس کا نام باقی رکھ گئی ہے۔ وہ خود اس پر فخر کیا کرتا تھا چنانچہ کتاب کے آخر میں لکھ گیا ہے۔

"مسکه ضیائی برنی مولف تاریخ فیروز شاہی ام دریں تالیف ساحریہا کرده‌ام ودانایان علم تاریخ سیمرغ کیمیا شده اند ہم دانند که ہزار سال

---

۱ فتوح السلاطین، ص ۴۳۴

بار مثل تاریخ فیروز شاہی کہ جامع اخبار واحکام جہانیان است ہیچ
مورخ را دست نداده است »[۱]

اور اسی طرح خواجہ عبدالملک عصامی کا نام اُس کے شاہنامہ فتوح السلاطین کی بدولت زندہ ہے۔ وہ دولت آباد دہلی سے اٹ پُٹ کر گیا تھا۔ قاضی کمال الدین کی وساطت سے علاؤ الدین بہمن شاہ کے دربار میں باریاب ہوکر یہ مثنوی لکھ ڈالی۔ برنی کی طرح اس نے بھی عزلت زندگی گزاری اور اپنی اس معنوی یادگار کے بارہ میں یہ لکھ گیا ہے

نہادم یکــــی بوستان اساس	ریاحین بکشتم درو بی قیاس
بگہ کن کزین گلشن دلکشا	کہ تازہ بود بر صباح ومسا
برواق شد اقصائی ہندوستان	گلی بوشگفت اندرین بوستان
بحمدالله اندر چنین روزگار	بشکر خـــداوند پروردگار
چنین خوش کتابی بکردم تمام	کنون باو مقرون بر خاص و عام[۲]

در ہر صورت اس عہد کی تاریخ اور فارسی ادبیات کا کوئی طالب علم ضیاؤ الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہے اور بے اعتبار قرار نہیں دے سکتا ہے جس طرح تصوف کے حلقہ میں فوائد الفواد ایک بے مثال دستاویز ہے اور فتوح السلاطین عہد ممالیک ہند کی ایک منظوم داستان ہے اسی طرح تاریخ فیروز شاہی اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر اس عہد کا ایک تاریخی مرقع ہے۔

---

۱ تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۲۳　　　۲ فتوح السلاطین ، ص ۵۷۸-۵۷۹

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

آغا حشر کی ایک نایاب نظم

آغا محمد شاہ کاشمیری متخلص حشر (۱۹۳۵-۱۸۷٦) کشمیر الاصل اور آغا حشر کے نام نامی سے موسوم ہیں ۔ وہ اردو ادب کے کرسٹوفر مارلو (Cristopher Marlowe) اور ہندوستانی ڈرامہ کے ولیم شیکسپیئر (William Shakespeare) تسلیم کئے جاتے ہیں ۔

اپنی طالب علمانہ زندگی ہی سے آغا حشر کو ڈرامے اور شاعری سے انتہائی شوق و شغف تھا وہ ڈرامے لکھتے اور حصہ بھی لیتے ، شعر کہتے اور مشاعروں میں چھپ چھپ کر شریک بھی ہوتے ۔ اس زمانے میں ایک طرف منشی ونایک پرساد طالب ، امانت لکھنوی ، مرزا نظیر بیگ اور رونق بنارسی جیسے کہنہ مشق ڈرامہ نگار تھے تو دوسری جانب پنڈت نرائن پرساد بیتاب اور مہدی حسن احسن جیسے نوجوان ڈرامہ نویس تھے ۔ آغا حشر کو ان حالات میں اپنا راستہ الگ بنانا پڑا اور تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے اپنی انفرادی قابلیت کی وجہ سے ڈرامہ نویسی میں مقبولیتِ عام کی سند حاصل کی اسی طرح بمبئی کے قیام کے دوران منشی تحمل حسین جیسے ممتاز شاعر اور انکے شاگرد شعرا اور رفقائے کار سے آغا حشر کا رابطہ قائم ہوگیا اور مشاعروں میں شریک ہوکر اپنا کلام سنانے لگے ۔ سوئے اتفاق سے ایک روز ایک مشاعرے میں آغا حشر کے کلام اور انکے زبان وبیان پر اعتراضات کئے گئے اور خوب نوک جھونک ہوئی ، اگرچہ آغا حشر نے انکے اعتراضات کے خاطر خواہ جوابات بھی دیئے لیکن اس افسوسناک واقعہ کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے احساس کم علمی کے پیش نظر علم عروض اصول بیان اور قواعد اردو کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا اور زبان وبیان پر قابو پالیا ۔ اسی وقت شاہ تغزل مرزا داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا اور شعرائے اردو حلقۂ داغ میں داخل ہونے میں مسرت ہی نہیں محسوس کرتے بلکہ سعادت تصور کرتے تھے آغا حشر نے بھی اپنا زانوے تلمذ تہہ کیا اور مرزا داغ سے رشتہ جوڑ لیا اور اس طرح انہوں نے غزل اور نظم میں طبع آزمائی کرکے اپنے لئے پروقار جگہ بنائی آغا حشر کا اسلوب سخن منفرد اور بے مثال ہے سلاست وروانی اور چستی وبرجستگی کے ساتھ ساتھ انکے شعروں میں بندش الفاظ اور جدت تراکیب نمایاں ہے بلکہ حرکت وعمل کا جوش بھی دکھائی دیتا ہے دوسرے لفظوں میں آغا حشر کے

کلام میں اعلیٰ اقدار انسانی کے علاوہ عزم و عمل کا سبق بھی ملتا ہے۔ ذیل کی غزل جس سے انکی ادبی شان ظاہر ہوتی ہے، ملاحظہ ہو ؎

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا
بت کافر ہمارا بھی خدا ہوتا تو کیا ہوتا

کوئی لذت نہیں ہے پھر بھی دنیا پیار کرتی ہے
خداوندا محبت میں مزا ہوتا تو کیا ہوتا

جب اتنی بے وفائی پر اسے دل پیار کرتا ہے
جو یارب وہ ستمگر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

سنا ہے حشر وہ ذکر وفائے غیر کرتے ہیں
جو میرا بھی وہاں کچھ تذکرہ ہوتا تو کیا ہوتا

اشعار ذیل میں آغا حشر کے زور بیاں اور طرز انشا کو دیکھئے ؎

دنیائے بے ثبات میں ہر شے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے ہر صبح کی ہے شام

گر دلوں میں اتفاق اور خواہشوں میں میل ہے
زندگی کی راحتوں کو فتح کرنا کھیل ہے

تری صورت تری باتیں مرے دو ہی سہارے ہیں
تجھی کو دیکھکر دنیا میں اتنے دن گذارے ہیں

ہزاروں دوست بن جاتے ہیں اگر خوش نصیبی میں
مگر وہ دوست ہے جو ساتھ دے دکھ اور غریبی میں

محسن کی قدر کرنا فرض ہے انسان کا
یہ سمجھ کر چھوڑ دو بدلہ دنیا احسان کا

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھکو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

نہ زندگی ہے ہمارے بس میں نہ موت ہی اختیار میں ہے
کسے بنانا کسے مٹانا یہ قصہ کردگار ہی ہے

آسودگی روح نشاط نظر نہیں
دنیا میں کچھ نہیں ہے محبت اگر نہیں

آغا حشر کی نظموں میں موج زمزم اور شکریۂ یورپ کافی مقبول ہوئیں لیکر شکریۂ یورپ (جو شاہکار تصور کی جاتی ہے) وہ نظم ہے جو آغا حشر نے اپنے دوران قیام شمس العلما حکیم فقیر محمد چشتی کے عشرت کدے پر انکے اصرار پر چند گھنٹوں میں فی البدیہہ لکھی یہ نظم مسلمانوں میں احساس و بیداری پیدا کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی حکیم صاحب کی ایما پر اسی وقت اسکی کتابت کروائی اور مرغوب ایجنسی لاہور نے اسے شائع کیا اور دوسرے روز جمعہ ۲۱ مارچ ۱۹۱۳ع کو آغا حشر نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے اٹھائیسویں سالانہ جلسے میں یہ نظم مترنم آواز میں پڑھی اور سامعین سے داد تحسین حاصل کرلی۔ اس انجمن کے سالانہ جلسوں میں عموماً خواجہ الطاف حسین حالی۔ علامہ محمد اقبال اور آغا حشر

کاشمیری اور خواجہ حسن نظامی جیسے مخدومین ادب شرکت ہی نہیں کرتے بلکہ اپنی قومی ومذہبی نظمیں سناتے۔ اس نظم شکریۂ یورپ میں آغا حشر نے مسلمانانِ عالم کے اضطراب دروں کا اظہار کیا ہے اور یورپ کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا ہے۔ یہ نظم نہ صرف بصیرت آموز ہے بلکہ ایمان افروز بھی اور ندرتِ خیال اور جدت فکر کا دل پذیر نمونہ بھی۔ دراصل انسانیت کا احترام حشر کا دین اور قومی اقدار کی پاسداری ان کا ایمان تھا۔ ذیل کے بند کو باغیانہ تصور کرکے حکومت برطانیہ نے اس نظم کو قابل ضبطی قرار دیا اور اپنے حکم نامہ کے تحت اس بند کے خارج کرنے کی تاکید کی اور بالفعل دوسری اشاعت میں اس بند کو خارج از نظم کیا گیا۔

اے زمینِ یورپ اے مقراضِ پیراہن نواز اے حریفِ ایشیا اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بیداد افگنی کاشانہ ہے تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے خونچکاں روداد اقوام گریباں چاک ہے
صرفِ تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری آدمیت سوز ہے تہذیب حیوانی تری
عظمت دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے ڈھل گیا حسن قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کردیا جنت دنیا کو دوزخ کا نمونا کردیا
اٹھ رہا ہے شورِ غم خاکستر پامال سے کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبان حال سے

بر مزارِ ما غریباں نے چراغی نے گلی
نے پرِ پروانہ سوزد نے سراید بلبلی

اس نظم کا پیش لفظ اردو کے ممتاز ادیب وشاعر خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے اور نظم وپیش لفظ دونوں پیش ہیں

اس ضمن میں یہ عرض کردینا مناسب ہے کہ آغا حشر جہاں شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار اور قادر الکلام شاعر ہیں وہاں انہوں نے ایک دیندار مسلمان کی حیثیت سے مبلغ اسلام کا رول بھی ادا کیا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ان کے زمانے میں شدھی، سنگھٹن اور عیسائیت کا اہلاغ زوروں پر تھا اور مولانا ابو الکلام آزاد علامہ محمد اقبال، خواجہ حسن نظامی اور آغا حشر کاشمیری کبھی انفرادی طور پر اور کبھی ملکر آریہ سماج کے رضاکاروں اور عیسائی مشنریوں سے مناظروں میں حصہ لیتے اور اس سلسلے میں اس کے توڑ یا رد کے طور پر یہ حضرات کبھی کلکتہ میں گوہر جان کی کوٹھی پر، کبھی لاہور میں حکیم فقیر محمد چشتی کے دولتکدے پر کبھی دہلی میں خواجہ حسن نظامی کے دائرہ پر اور کبھی بمبئی میں آغا حشر کاشمیری

کے عشرت کدے پر ملاقاتیں ہوا کرتیں اور صلاح و مشورہ اور اس کے روک تھام کی تدابیر پر غور و خوص کیا کرتے لیکن تھوڑے ہی وقفے کے بعد تجارتی کاروبار اور دیگر مصروفیتوں کے پیش نظر آغا حشر نے اس مشن سے اپنے کو الگ کرلیا اور اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوگیا

اس امر کا اقبال کرنا ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابچہ مجھے اپنے محسن اور بزرگ جناب عباس دلال صاحب کے ذاتی کتبخانے میں ملا۔ جنہوں نے آغا حشر سے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی دلال صاحب بمبئی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ہیں اور ان کی عمر اس وقت کوئی اسی (۸۰) سال ہے اور اس طرح انہوں نے آغا حشر کے متعلق بہت کچھ معلومات فراہم کی ہے۔ دلال صاحب کے والد بزرگوار جناب اکبر علی دلال صاحب الیکزینڈرا تھیٹریکل کمپنی (Elexandra Theatrical Company) کے مالک تھے اور بمبئی کے دوران قیام میں آغا حشر کے ان سے گہرے مراسم پیدا ہوگئے۔ آغا حشر نے اس کمپنی کے لئے نہیں بلکہ نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی (New Alfred Theatrical Company) کے لئے ڈرامے لکھے اور شہرت حاصل کرلی۔ یہ کتابچہ مع پیش لفظ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

●

کتابچہ کا ٹائیٹل صفحہ

شکریۂ یورپ

جسو

ہندوستان کے مشہور انشا پرداز و ڈراما نویس

جناب آغا محمد شاہ صاحب حشر کاشمیری

نے

انجمن حمایت اسلام لاہور کے اٹھائیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی

اور

مالک و مہتمم مرغوب ایجنسی لاہور نے مصنف موصوف سے

تحریری اجازت حاصل کرکے

یونین سٹیم پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کی

۱۹۱۲ عیسوی قیمت دو آنے

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری

(یہ تصویر اُس وقت کی ہے جبکہ آغا حشر نظم شکریۂ یورپ لکھ رہے تھے)

پیش لفظ
از
خواجہ حسن نظامی

کاشمیری آغا حشر نے شکریہ یورپ کے نام سے جو نظم لکھی وہ شاعرانہ تخیل اور فکر ذہن کی احسانمند نہیں ہے۔ اسکو محض نظم کی حیثیت سے سننا اور پڑھنا ظلم ہے کیونکہ اس میں جو کچھ ہے وہ مسلمانان عالم کے اضطراب درونی کا اظہار ہے

آغا حشر میرے ہندوستان کے، اردو زبان کے، پرانی جان پہچان والے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنکو خدا نے اس صدی کا بےمثل ہندوستانی ڈراما نویس بناکر بھیجا۔

یورپ اپنے شیکسپیئر پر فخر کرتا ہے جو بیکن کا گراموفونی ریکارڈ تھا تو ہندوستان کو آغا حشر پر ناز ہے جس کی کارگذار طبیعت کسی بیکن کی واردارانہ اعانت کی زیر بار نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی اسٹیج پر آغا کا یہ پہلا پارٹ ہے۔ اگر پہلا وار ہے تو واقعی بھرپور ہے نظم کے تیور، الفاظ کی بندش، نرالی اور انوکھی روش سب گواہ ہیں کہ یہ نظم قیامت ہے یا قرب قیامت کی نشانی

یورپ کو اگر ایشیا کے ستانے، مسلمانوں کو ٹھکرانے میں مزا آتا ہے تو ہم کو آغا حشر کے اس طمانچہ سے لطف حاصل کرنا چاہیے جو رخسار سفید پر دستِ سیاہ سے مارا گیا ہے مگر ایسا نہ ہو کہ جناب مسیح کے پیرو انجیل کے قول پر عمل کرکے دوسرا رخ بھی سامنے کردیں اور اس شاعرانہ شکریہ کے نازک ہاتھ کے بدلے کسی وحشی کوہستانی کا ہاتھ سامنے آجائے۔

آغا حشر نے اردو ڈراموں کے ذریعہ ہندوستان اور اردو زبان کی اسی بڑی خدمت کی ہے اور وہ ایک ایسی چلبلی البیلی مگر فلسفیانہ طبیعت لیکر آئے ہیں جس کی داد نیم بیدار ملک سے ملنی دشوار ہے۔

ذرا خدا لگتی کہنا اور حشر کی اس نظم کو دیکھنا لفظوں اور معانی کے لشکر نا آشنا میدانوں میں کس شان سے چڑھ کر آئے ہیں۔ طبع مسلم کے کمانڈر نے کیسی ہوش ربا مورچہ بندی کی ہے۔

شیکسپیئر کو قبر کے اسٹیج سے ملانا، ایشیا کے عشرستان میں صور کی آواز سنے، مقتولین کی کس کشائی دیکھے۔

جو مسلمان دم توڑ رہا تھا، موت کی آخری ہچکیاں لے رہا تھا، اسکو عیسائی کی قاتل بے رحم ٹھوکر نے مارنے کی جگہ جلا دیا، زہر کا گھونٹ آب حیات بنگیا، بجھی ہوئی راکھ کو ٹھنڈا اور ملیامیٹ کرنے کی کرید نے ایک چنگاری نمودار کردی

حشر کے ایشیائی دل نے اسی واسطے جفا پیشہ یورپ کا احسان مانا ہے۔ شکریہ ادا کیا ہے کہ نہ تو ایسا کرتا نہ ہماری بیداری‌واحساس کی تیغ میاں سے کھنچتی۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی احرار اس لطیف و پر معنی نظم میں اپنے درد کی دوا نہیں تو تیمارداری کی سراپا تسلّی ادائیں تو بہت سی پائینگے اور جناب حشر سے تقاضا کیا جائیگا کہ وہ اسی قسم کی گرجتی، برستی نظمیں اور لکھیں تاکہ دلوں کی خشک سالیاں دور ہوں۔

اس شکرانہ اور تھینکس کا جواب شائستہ اور مہذب یورپ کی طرف سے تقاضائے تہذیب ضرور ہونا چاہیے میں نہیں جانتا کہ قصوروار یورپ کیونکر ایشیا سے آنکھ سامنے کرکے اس «تھینکیو» (Thank you') کے جواب میں «ڈونٹ منشن پلیز» (Don't mention, please') کہہ سکے گا۔

نظم شکریہ یورپ کا یوں تو ہر مصرع کوہ آتش فشاں ہے مگر آخر کی دعا نہایت موثر اور آدمی کے خاکستانی پیکر میں ہل چل ڈالنے والی ہے جس کا جواب افق محفوظ پر ایک آنکھ کو یہ منقوش نظر آیا۔

جناب آغا اور سب مسلمانوں کو اطلاع دو کہ اسکو یاد رکھیں

سلام قولا من رب الرحیم

یعنی رحمت والا پروردگار سلامتی کا قول دے چکا ہے۔ تو پھر مسلم حق پرست کیوں ہراساں ہوتا ہے ع

جب تک حق ہے حقدار سلامت رہیگا

●

نظــم

شکریۂ یــورپ

از

آغـا محمد شاہ حشر کاشمیری

مدتوں سے نغمۂ توحید محوِ خواب تھا — ساز ہستیِ مسلماں تشنۂ مضراب تھا
پیکرِ احساس میں خوابیدہ روحِ درد تھی — شعلۂ ریزیِ نوا ہائے اخوت سرد تھی
گرچہ کانپا تھا ابھی ہستیِ مسلم پُر خروش کم — گرم ہنگامہ تھے سب یہ محشرِ خاموش کم
عاشقِ رنگیں تماشہ حیرتی حال تھا — روزگارِ جلوہ را کے اب یہ کیف الحال تھا
آمد و رفتِ نفس لاتی تھی پیغامِ حیات — ورنہ بندر خود فراموشی تھا ناکامِ حیات
چشمِ بینا حیرتِ طفلانہ کا گہوارہ تھی — صرفِ تعمیرِ تحیر طاقتِ نظارہ تھی
نغمہ سنجِ قدس چپ تھا، گاش تکبیر میں — بند تھا شورِ اذاں مسلم لبِ تقریر میں

مدعی صد جلوۂ آشوب را آئینہ بود
یک جہاں بیقراری دم بخود در سینہ بود

وہ پیامِ آخری اسلام جس کا نام تھا — وہ ظہورِ صدق جو پروردۂ الہام تھا
وہ تجلیِ حقیقت جو ضلالت سوز تھی — گرمیِ قلبِ محمد سے تپش اندوز تھی
روشنی دنیا کو دی جس مہرِ عالمتاب نے — زنگِ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقتِ انساں کو بینا کر دیا — سنگریزے کو جلا دیکر نگینہ کر دیا
شعلے پیدا کر دیئے خاکسترِ افسردہ میں — زندگی کی لہر دوڑا دی حیاتِ مردہ میں
شورشِ ہنگامہ آرا آب و گل میں ڈالدی — شورِ نادل کا تڑپ بجلی کی دل میں ڈالدی
اک ہلچل پڑ گئی جذباتِ رنگ آلود میں — آگ سی گویا لگا دی تودۂ بارود میں

بارہا نالید و گفت اے قومِ ما بیدار شو
حصۂ خود از حریفاں گیر و گرمِ کار شو

بر زغوغا شد جہاں شورم بہمت احتز گذشت — پنبہ در گوشی چرا؟ برخیز کآب از سر گذشت
مایۂ صداقت اسمع این گوش ناشنوائے تو — نوش کس زامروز گردد خوارتر فردائے تو
شرم کن عوادائے کفر ساماں کردۂ — آں دل و جانے کہ اول نذرِ قرآں کردۂ

اے کہ فطرت بزم و ہمت بے چو آہن داشتی — قطرۂ بودی، مگر طوفاں بدامن داشتی
بر کش از صہبائے دوشیں ساغر ایام را — بار رنگ جلوہ دہ از صبح ماضی شام را
صرف نسیاں نیست غرناطہ و بغداد شد — بار برخواں آں سبق کو خلق را از یاد شد
سطوت فاروق بنما شیوۂ حیدر بگیر — تاج از کسریٰ ستاں و باج از قیصر بگیر

حال و استقبال ہر دو حاصل تدبیر تست
ہاں بجہد آمادہ شو در دست تو تعمیر تست

ہاں چھڑک پیشانی ظلمت پہ افشان سحر — ٹانک دے داماں شب میں پھر گریبان سحر
پھر منور کر دل کو نور احمد ﷺ میم سے — جگمگا دے بزم جاں کو شمع ابراہیم سے
اپنی ہستی نذر دے ملت کی قربانگاہ کو — زندہ کر دنیا میں آئین خلیل اللہ کو
ڈال دے شور نوا معمورۂ ظلمات میں — دوڑ جا آہنگ بنکر ساز موجودات میں
خاک کو بھر دے سرور آسماں پرواز سے — گرم کر دے روح مستی شعلۂ آواز سے
حسن آرائش سے زینت عالم امکاں کو دے — خلعت تجدید آئین کہن ساماں کو دے
کلیات دہر کی اک شرح نو تحریر کر — نظم ہستی کی نئے الفاظ میں تفسیر کر

طرح نو انداز و بنیاد جہاں از سر فگن
شعلہ در پیراہن آتش بخشک و تر فگن

تیری لب بندی سبق آموز گویائی ہوئی — طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی
آج ان دروں کو بھی نارابی اباہی پہ ہے — تیرے در کا نقش سجدہ جنکی پیشانی پہ ہے
منتظر نظارے ہیں چشم خمار آلود کھول — اٹھ کلید فتح بن قفل در مقصود کھول
اے خوشا لمحات خواب بن اثر کچھ بھی نہیں — کان ہے سب کچھ سنا دل کو خبر کچھ بھی نہیں
گو صدائے ہمت افزا تا بگوش آتی رہی — نالہ بنکر پیہم آواز سروش آتی رہی
پھر بھی ننگ زندگی آسودۂ خواری رہا — سونے والے پر وہی خواب گراں طاری رہا
جب تغافل اپنا شیوہ جنتہ قسمت نے کیا — اور ہی ساماں بیداری مشیت نے کیا

دفعتاً از جلوۂ عیسیٰ افق تابندہ شد
قم بادنی گفت مغرب روح مشرق زندہ شد

اے زمین یورپ اے مقراض پیراہن نوار اے حریف ایشیا! اے شعلۂ خرمن نوار
چارہ سازی تیری بنیاد افگن کاشانہ ہے تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشک حسرت راسے چشم حریت نمناک ہے خونچکاں روداد اقوام گریباں چاک ہے
صرف تصنیف ستم ہے فلسفہ دانی تری آدمیت سوز ہے تہذیب حیوانی تری
عظمت دیرینہ پامال ہے ترے برتاؤ سے ڈھل گیا حسن قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہ شوکت مشرق کو سونا کر دیا جنت دنیا کو دوزخ کا نمونا کر دیا
اٹھ رہا ہے شور غم خاکستر پامال سے کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبان حال سے

بر مزار ما غریبان نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے امت خیر الوری لیکن تری ممنون ہے
کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم ملت کھل گئی
چوٹ کھا کر بھر گیا دل لذت ایثار سے جلوے جاگے شیشۂ شکستہ کی جھنکار سے
یک بیک خون تن بیجان میں ہیجان آگیا قطرہ دریا بن گیا دریا میں طوفان آگیا
چونک اٹھی روح اخوت ایک دل خستہ ہوئے پتیاں گل بن گئیں گل مل کے گلدستہ ہوئے
ہو گئیں یکجا بکھری ہوئی اینٹیں بہم تعمیر کی مل گئی ہر اک کڑی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی
بت شکن وحدت پرست اک جسم اک جان ہو گئے غل ہوا دنیا میں پھر کافر مسلمان ہو گئے

از کرم بپذیر یارب جوش بے اندازہ را
تاقیامت زندہ دار این زندگی تازہ را

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے بادلو ہٹ جاؤ دیدو راہ جانے کے لئے
اے دعا ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے اے خدا اب پھیر دے رخ گردش ایام کے
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسر پیکار ہیں وقت اور تقدیر دونوں در پئے آزار ہیں
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزش غم کے لئے کر رہے ہیں زخم دل فریاد مرہم کے لئے
رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دینگے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

• • •

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

کارگہہ شیشہ گری — میر کا مطالعہ

زیر نظر کتاب ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے میر تقی کے مطالعے کا حاصل ہے۔ اس میں میر پر فاضل تنقید نگار کا ایک مقدمہ اور تین تنقیدی مضامین شامل ہیں اس میں تنقید نگار نے مقدمہ میں بتایا ہے کہ چونکہ عام طور پر اکثر دیدہ ور شاعروں کی ندرت فکر اور جدت کاری ان کے اپنے دور میں یا آنے والے ادوار میں ناقابل شناخت رہتی ہے اس لئے وہ زیادہ تر غفلت کاری یا ناقدری کا شکار ہو جاتے ہیں مگر بعد میں ادبی شعور کی توسیع پذیری اور ان کی نئی دریافت کی وجہ سے ان کی صحیح قدر وقیمت بے چوں وچرا تسلیم کرلی جاتی ہے۔ میر تقی میر کے ساتھ بھی کم وبیش ایسی ہی صورت پیش آئی پھر انھوں نے میر پر اب تک کی لکھی ہوئی اکثر اہم تنقیدات کا سرسری جائزہ لینے کے بعد بتایا ہے کہ یہ ساری کی ساری تنقیدیں کسی گہرے تنقیدی شعور کو ظاہر کرنے کی بجائے شخصی پسند و ناپسند کے سطحی رویے کی غمازی کرتی ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم موجودہ تنقیدی نظریات کی حد بندیوں سے نکل کر تنقید کا ایک حقیقت پسندانہ راستہ اپنائیں اپنی نازک حسیت، بصیرت، لسانی شعور اور گہرے ادراک کی مدد سے شاعر

کے طلسم کدوں کے جادوئی دروازوں کو وا کرکے قاری پر اس کے اسراری جلووں کی شناخت کو عام کریں۔

پہلے مضمون میں حامدی صاحب نے شاعر کے تخلیقی عمل پر اثر انداز ہونے والے سارے داخلی اور خارجی عوامل کا جائزہ لینے اور اس سلسلے میں مغربی اور ہندوستانی تنقید نگاروں کے نظریات کو واضح کرنے کے بعد بتایا ہے کہ میر خالصاً ایک تخلیقی فنکار تھے اور ان کے یہاں تخیل کی کارگذاری اور عملداری بے حد نمایاں ہے پھر میر ہی کے اشعار کی مدد سے واضح کیا ہے کہ میر کی تخیل پسندی کے رجحان کو کن کن داخلی اور خارجی عوامل سے مدد ملی ہے اور دوسرے میں انھوں نے بتایا ہے کہ میر نے پوری توانائی کے ساتھ زبان کو اپنی شعری ضروریات کے لئے برتا ہے اور فارسی کے دلدادہ ہونے کے باوجود انھوں نے فارسی کی روایت کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا ہے۔ پھر میر کے اشعار کی مدد سے بڑی تفصیل سے سمجھایا کہ میر کس طرح کسی بھی تاثر، حس، واقعہ کیفیت یا احساس کو مناسب لفظوں میں ڈھال کر پیکر تراشی کا حق ادا کرتے ہیں اور کس طرح ان کی یہ پیکر تراشی ان کے گہرے اور بوسیدہ ہی شعور پر دلالت کرتی ہے اور آخر میں کاشمیری صاحب میر سے پہلے کے اکثر اردو شعرا کے کلام کا سرسری جائزہ لینے کے بعد بتایا ہے کہ میر نے اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں اپنے تجربات کی مدد سے لفظ ومعنی کی ایک نئی ہی دنیا تخلیق کی ہے اور ان کے اظہار کے لئے زبان وبیان کے مخصوص شخصی اور فنی برتاؤ سے شعری لسانیات کی ایک نئی تشکیل و تہذیب کا کام انجام دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ صدی میں بھی اقبال اور ترقی پسند شعرا کی ساری بلند آہنگی، مقصدیت اور موضوعیت کے باوجود آج کے شاعر میر سے مانوس ہیں اور میر کی داخلی، حزنیہ اور مدھم لے سے قربت محسوس کرتے ہیں۔

حامدی کاشمیری ایک کہنہ مشق تنقید نگار، ادیب اور شاعر ہیں، انھوں نے افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے مگر تنقید نگاری میں کافی مشہور ہیں جدید اردو نظم اور یوروپی اثرات، غالب کے تخلیقی سر چشمے،

نئی حسیت اور اردو شاعری، اقبال اور غالب کے نام سے ان کے چند تنقیدی مجموعے پہلے ہی شائع ہوچکے ہیں، کارگہہ شیشہ گری۔ میر کا مطالعہ، اس سلسلے کا ایک اور مجموعہ ہے چونکہ اس میدان میں آئے ہوئے انہیں بیس پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے اس لئے ان کی تنقیدوں میں خاص قسم کی خود اعتمادی پختگی اور جرأت پائی جاتی ہے علاوہ ازیں چونکہ انہیں انگریزی ادبیات پر بھی کافی عبور حاصل ہے اس لئے وہ جو بات بھی کہتے ہیں نہایت واضح اور صاف الفاظ میں کہتے ہیں اور پورے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں۔ "میر کا مطالعہ" ان کے اس تنقیدی شعور کی اچھی مثال ہے۔ اس کو پڑھ کر نہ صرف یہ کہ میر کی شاعری اور ان کی فنکارانہ عظمت کے متعدد نئے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ فاضل تنقید نگار کی طرح ہمارے دلوں میں بھی یہ احساس جاگ اٹھتا ہے کہ

"میر بد قسمتی سے آج تک نقادوں کو صحیح معنوں میں اپنی طرف متوجہ نہ کرسکے، اس میں میر کی کوتاہی یا کمی سے زیادہ نقادوں کی بے اعتنائی یا غفلت شعاری کو دخل رہا ہے، اردو میں جو گنتی کے نقاد ہیں وہ بھی شاعری کا مطالعہ اور محاکمہ کرنے میں پوری ذہنی آزادی معروضیت اور ایمانداری کو روا نہیں رکھتے وہ اکثر موقعوں پر گروہ بندیوں اور مصلحت اندیشیوں کے شکار ہوکر ماضی کے ورثے یا ہمعصر ادب کے ساتھ انصاف نہیں کرتے، وہ سیاست اور مالی منفعت کی تحریک پاکر غالب اور اقبال کے بارے میں دفتروں کے دفتر سیاہ کردیتے ہیں لیکن میر کی جانب نگاہ اٹھانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔"

• • •

کارگہہ شیشہ گری۔ میر کا مطالعہ از ڈاکٹر حامدی کاشمیری

ادارۂ ادب، ۳۹۶ جواہر نگر، سری نگر، (کشمیر)

قیمت : پینتالیس روپے
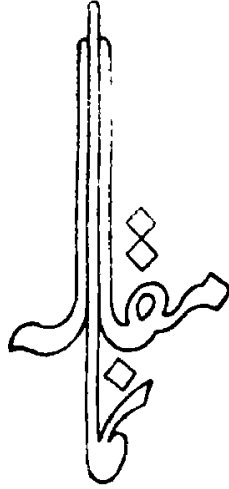
مذہبیات واسلامیات

صدر الدین بٹ

عربی ادب کا ارتقاء

ماہنامہ المعارف ، لاہور ، مارچ ۱۹۸۳ ع
جلد ۱۶ ، شمارہ ۳ ، ص ۵ - ۱۶

لفظ « ادب » کی اصل کیا ہے اور عربوں نے اسے کس طرح معنی پہنائے ہیں اسکا جائزہ لیا گیا ہے ۔

خلیل الرحمان سجاد ندوی

اسرار ومعراج - چند اشارات واسرار قرآن مجید کی روشنی میں

ماہنامہ الفرقان ، لکھنؤ ، مئی ۱۹۸۳ ع
جلد ۵۱ ، شمارہ ۵ ، ص ۲۱ - ۳۵

قسط اولین میں فاضل مقالہ نگار نے واقع کی جامع تفصیل دیتے ہوئے وقت کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ معراج جسمانی یا روحانی/ خواب تھا یا بیداری کی طرف روشنی ڈالی ہے ۔

سید محمد سلیم

مرکبات تفسیری

ماہنامہ اخبار اردو ، کراچی ، مارچ ۱۹۸۳ ع
جلد ۳ ، شمارہ ۳ ، ص ۱۰ - ۱۲

ایک زبان کے لوگ دوسری زبان کے الفاظ سمجھنا چاہتے ہیں ۔ بازاری اور کاروباری لوگوں میں یہ خواہش شدید ہوتی ہے ۔ پوری زبان سیکھنا اور بولنا تو دیر طلب کام ہے البتہ مفرد الفاظ کا سیکھنا آسان ہے ضرورتمند افراد دوسری زبان کے الفاظ سیکھ لیتے ہیں اور پھر دونوں ہم معنی

الفاظ کو جمع کر کے بولتے ہیں تاکہ دونوں قوموں کے افراد سمجھ لیں ۔ اسطرح کاروبار میں نقصان واقع نہ ہو ۔ اس طریقے سے مرکب تفسیری اور ترادلی وجود میں آتے ہیں۔

مرکب تفسیری اردو زبان کا ایک اہم حصہ ہیں ۔ چند مثالیں مندرجہ ذیل زبانوں سے پیش کی گئی ہیں ۔

۱) آریائی اور دراوڑی زبانیں
۲) یوچی اور کشن دور
۳) یونانی اردو
۴) فارسی عربی
۵) فارسی ہندی
۶) ترکی اردو
۷) پشتو اردو
۸) پرتگالی اردو
۹) انگریزی اردو

سید محمد فاروق بخاری

علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی قرآن فہمی

ماہنامہ معارف ، اعظم گڈھ ، اپریل ۱۹۸۳ع
جلد ۱۳۱ ، شمارہ ۴ ، ص ۲۸۰ ـ ۲۹۷
مئی ۱۹۸۳ ، جلد ۱۳۱ ، شمارہ ۵ ،
ص ۳۶۸ ـ ۳۸۸

علامہ محمد انور شاہ اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ قرآن میں دنیا بھر کا رطب و یابس موجود ہے وہ زوردار الفاظ میں ان لوگوں کی تردید کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں نیوٹن کا نظریۂ تجاذب ، ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ، آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافت وغیرہ ڈھونڈتے ہیں ۔ انکے نزدیک یہ قرآن کی خدمت نہیں ہے بلکہ اس سے زیادتی ہے ۔

انکی رائے میں قرآن کے مقاصد وہ ہونے چاہئیں جن سے مبداء ومعاد اور معاش پر فلاح ونجاح دنیا وآخرت وابستہ ہو ۔

ضیاء الدین اصلاحی

قرآن مجید میں قصۂ ابراھیم اور مستشرقین کے اعتراضات

ماہنامہ معارف ، اعظم گڈھ ، مارچ ۱۹۸۳ع
جلد ۱۳۱ ، شمارہ ۳ ، ص ۱۶۵ ـ ۱۸۷

حضرت ابراھیم اور انکی اسماعیلی نسل ، عربوں اور مسلمانوں کے معاملہ میں اہل کتاب کا رویہ شروع ہی سے معاندانہ رہا ہے اب بعض مستشرقین بھی ان ہی کے نقش قدم پر گامزن ہو کر اس طرح کی بے سر وپا باتیں کررہے ہیں ۔

ضیاءالدین لاہوری

فورٹ ولیم کالج کا ترجمۂ قرآن مجید

ماہنامہ المعارف ، لاہور ، مارچ ۱۹۸۳ع
جلد ۱۶ ، شمارہ ۳ ، ص ۱۷ ـ ۲۶

قرآن مجید کے ترجمے کا کام ۱۸۰۳ع میں شروع کیا گیا شروع میں میر بہادر علی حسینی مولوی امانت اللہ اور مرزا کاظم علی جواں کو اس کام پر مامور کیا گیا ۔ بعد

میں مولوی فضل اللہ بھی ان میں شامل کردیئے گئے۔

قرآن مجید کا ترجمہ مکمل ہوجانے کے باوجود صرف ۵۶ صفحات کی طباعت تک محدود رہا یہ حصہ ۱۸۰۳ء میں طبع ہوا مگر ۱۸۰۷ء میں گورنر جنرل باجلاس کونسل کے احکام کے تحت بقیہ ترجمے کی اشاعت روک دی گئی۔

فورٹ ولیم کالج کا ۵۶ صفحات کا مطبوعہ نسخہ ترجمۂ قرآن، انڈیا آفس لائبریری، لندن میں موجود ہے اسکا نمبر 306-41-F-4 ہے۔

محمد عبدالحلیم چشتی

حکم اقراء کے ثقافتی پہلو
اور شاہان عباسی کی عالمگیر تحریک
کتب خانہ سازی کے اثرات

ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۸۳ء
جلد ۱۳۱، شمارہ ۴، ص ۲۶۲-۲۷۹
مئی ۱۹۸۳ء، جلد ۱۳۱، شمارہ ۵،
ص ۳۵۳-۳۶۷

اسلامی عہد میں مسلمانوں کی علمی تاریخ کا باب نہایت شاندار رہا ہے خاص طور پر عہد عباسی کو اس باب میں امتیاز حاصل ہے اس سے قبل انسانی تاریخ کے کسی دور میں ہمیں کتب خانوں کی اتنی کثرت و تنوع کا کہیں سراغ نہیں ملتا

عہد عباسی میں ہر شہر، قریہ، بستی، محلہ، گلی، کوچہ، معبد، مسجد، تکیہ، سرائے، محلسرا، مہمان خانہ، خانقاہ، سیرگاہ، گلستان، قبرستان، کنار دریا، مدرسے، ادارے، بازار، کان، ہر چھوٹی بڑی مرکزی جگہ میں حکم اقراء نے اپنا علمی مظاہرہ کیا اور کتبخانہ قائم کر دکھایا

عرفان احمد

عالم اسلام میں سائنس کے زوال کے
اسباب اور اسکے احیاء کے شرائط

ماہنامہ برہان دہلی، مئی ۱۹۸۳ء
جلد ۹، شمارہ ۵، ص ۴۷-۵۳
جون ۱۹۸۳ء، جلد ۹۰، شمارہ ۶
ص ۵۵-۶۱

اس میں شک نہیں کہ عالم اسلام کا سائنس کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے میں بہت سی خارجی وجوہات بھی تھیں لیکن داخلی وجوہات میں جس رویہ نے شدید ضرب لگائی وہ علم سے بے رخی اور تغافل ہے۔ جذبہ تجسس سرد پڑگیا تھا اس کمی کو دور کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اسلامی دنیا مشترکہ طور پر ایسے

اداروں و تحقیقی مراکز کے قیام کا انتظام کرے جو سائنسی تعلیم کی ترویج واشاعت میں ہر ممکنہ امداد دے ۔

محمد اسحٰق بھٹی

مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی کے چند مکتوب

ماہنامہ المعارف لاہور مئی ۱۹۸۳
جلد ۱٦ شمارہ ۵ ، ص ۲۹-۴٦

مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی نے محمد اسحٰق بھٹی صاحب کو جو خط لکھے تھے ان میں آٹھ خطوط پیش کئے گئے ہیں ۔ اسلوب تحریر خاصے کی چیز ہے ۔

محمد طفیل

جوزف شاخت اور اصول فقــہ

ماہنامہ معارف اعظم گڈھ اپریل ۱۹۸۳ع
جلد ۱۳۱ شمارہ ۴. ص ۲۴۵-۲۵۴

جوزف شاخت ۱۹۰۲ ع میں جرمنی میں پیدا ہوئے ان کاتعلق یہودی مذہب سے تھا ۔ بہت سی علمی ادبی تنظیموں کے رکن ہوئے ۔

اسلامی قانون کی ابتداء اسکی اثرپذیری اور اثراندازی انکا خاص موضوع ہے اور یہی اسکی شہرت کا باعث ہوا ۔

انہوں نے بے شمار کتب اور لاتعداد علمی مقالات یادگار چھوڑے ہیں ۔ انہیں علوم اسلامیہ کے درج ذیل شعبوں سے دلچسپی تھی ۔ ۱) اصول فقہ ۲) فقہ حنفی ۳) علم الکلام ۴) عربی مخطوطات

دو مستقل کتابیں بھی تحریر کیں جنکے نام یہ ہیں

1) The Origin of Muhammadan Jurisprudence
2) An Introduction To Islamic Law

شاخت کے خیالات کو اسلام کے خلاف تعصب کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا ۔

محمد یٰسین مظہر صدیقی

عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں ۔ محرکات ، مسائل اور مقاصد

ماہنامہ برہان دہلی اپریل ۱۹۸۳ ع جلد ۹۰
شمارہ ۴ ، ص ۵-۱٦
قسط ٦ مئی ۱۹۸۳ جلد ۹۰ شمارہ ۵ ص۵-۲۱
" ۷ جون " " " " ٦ " ۵-۲۰
" ۸ جولائی ، " ۹۱ " ۱ " ۵-۲۰

تمام پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان مہموں میں دشمن سے کسی قسم کی نبرد آزمائی مقصود نہ تھی ۔

لسانیات و ادبیات

حامد علی

تحقیق الفاظ

ماہنامہ اخبار اردو ، کراچی ، مارچ ۱۹۸۳ ع
جلد ۳ ، شمارہ ۳ ، ص ۱۲ ـ ۱۵

اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل الفاظ کی اصل کھوجنے کی سعی کی ہے ۔

۱) چاقو ۶) داراب داریاب
۲) رب النوع ۷) دھلیڈی
۳) اپنائیت ۸) جمادری
۴) قطن ۹) سکھجین
۵) سفینہ ۱۰) مصطگی

حسن الدین احمد

نواب میر محبوب علیخاں کے دور کے
چند ادیب اور شاعر

ماہنامہ سب رس ، حیدرآباد ہند ،
اپریل ۱۹۸۳ ع
جلد ۴۳ ، شمارہ ۴ ، ص ۲۰ ـ ۲۸

اس ضمن میں ڈپٹی نذیر احمد ، مولانا ظفر علیخاں ، مولوی عبدالحلیم شرر ، مہدی علیخاں ، عماد الملک ، سید حسین بلگرامی ، عزیز جنگ ولا ، سید جلال الدین ، توفیق ، پروفیسر عبدالغفور شہباز کی خدمات جلیلہ کا جائزہ لیا ہے ۔

عبد السلام خاں

اقبال کی شاعری میں
فرد اور جماعت کا تصور

ماہنامہ کتاب نما ، نئی دہلی ، اپریل ۱۹۸۳ع
جلد ۱۳ ، شمارہ ۴ ، ص ۵ ـ ۲۰

فرد اور جماعت کے متعلق انکا آخری موقف یہ تھا کہ جماعت متعین اغراض ومقاصد کیلئے ہم مقصد افراد کے ارادہ واختیار سے وجود میں آتی ہے ۔ یہ ایک طرح سے خاندان جیسی تعاونی تنظیم ہے اسکا جو کچھ بھی اقتدار واختیار ہے وہ خود فرد کا دیا ہوا ہے

اقبال کے معاشرے اور اسکے افراد پر سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ جسطرح انکا معاشرہ اپنی جگہ حقیقی کم مثالی زیادہ ہے اپنے اس تصور میں اقبال کو اسلام کے بالکل ابتدائی عہد سے مدد ملی ہے اور انھوں نے شاعرانہ مبالغے اور فنکارانہ جمال کے ساتھ اسکو پیش کیا ہے ۔

عبدالغنی

اردو ادب اور جدید تجربات

ماہنامہ شاعر بمبئی ، ۱۹۸۳ ع
جلد ۵۴ ، شمارہ ۱ ، ص ۲۲ ـ ۲۴

جدید تجربات کی جڑیں اردو ادب کی روایات میں نہیں ہیں بلکہ معاملہ ایک متبادل شجرکاری کا ہے تجربات کے یہ نئے پودے

کسی اجنبی خاک اور اسکی آب وہوا سے اکھاڑ کر اردو ادب کی زمین میں لگائے جارہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کے مزاج نے ابھی تک نظم آزاد کے تجربے کو قبول نہیں کیا ہے۔ یہی حال افسانہ نگاری کا ہے۔

سلیم اختر

.. شعر مرا ایران گیا
میر تقی میر کی شاعری کا جنسی مطالعہ
ماہنامہ شاعر بمبئی، فروری مارچ ۸۳ع
جلد ۵۴، شمارہ ۲ ـ ۳، ص ۸ ـ ۱۷

میر کی جنسی شاعری کی اساس دو جنسیت پر استوار ہے۔ جنس پر میر کے اشعار دیکھنے پر انکی اولیں خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اس نے اظہار بالکل واضح اور دو ٹوک قسم کا رکھا بعض اوقات یہ دو ٹوک لہجہ اس حد تک واشگاف ہوجاتا ہے کہ اسے خود بھی یہ کہنا پڑتا ہے «افسوس یہ شعر مبتذل تھا»

میر کی جنسی شاعری میں ہم جنسیت ایک قومی رجحان رکھتی ہے۔ ہم جنسیت کے ساتھ ساتھ اسکے ہاں ایک خاص انداز کی عاجزی نظر آتی ہے جو اپنے محدود مفہوم سے بڑھ کر ایذا پرستی کی حدود میں داخل ہوجاتی ہے۔

سیدہ طیبہ بیگم

عہد آصفی کے ادب میں خواتین کا حصہ
ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، مئی ۱۹۸۳ع
جلد ۴۳، شمارہ ۵، ص ۱۲ ـ ۲۲

آصف سابع نے پہلی مرتبہ طبقۂ نسواں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ زنانہ مدارس کھلے جامعہ عثمانیہ کے کلیہ انات بھی وجود میں آیا۔

علم کے زیور سے آراستہ ہوکر خواتین نے بھی ادب میں چار چاند لگا دیئے

بشیر النساء بشیر، طیبہ بیگم بلگرامی، صغرہ بیگم، سروجنی نائیڈو، زاہدہ بیگم، نجیبت النساء بیگم، سکینہ بیگم، بانو طاہرہ سعید، فاطمہ عالم، زینت ساجدہ، عظمت، محسنہ سلطانہ، سارہ بیگم، رقیہ بیگم، آمینہ ہارون، قیصری بیگم، جیسی سدی، پاشاہ بیگم، مسز برکت رائے، رتن کندن لال، تلسی مانک رام، شیل بالا، نوشابہ بیگم، جہاں بانو نقوی، لطیف النساء نعیم النساء، نجم النساء، قمر النساء، تصدیق فاطمہ، رفیعہ سلطانہ، جیلانی بانو، آمنہ ابو الحسن، عفت موہانی، رفیعہ منظور الامین، سیدہ جعفر کا مختصر تذکرہ ہے۔

شعیب اعظمی

فارسی شاعری
ایران کی تمدنی میراث

ماہنامہ جامعہ، نئی دلی، مئی ۱۹۸۳ ع
جلد ۸۰، شمارہ ۵، ص ۳۶ ـ ۵۰

فارسی شاعری فقط چند اساتذہ پر منحصر نہ تھی ہم صرف بڑے شعراء کے کلام ہی سے چند نتائج اخذ کر کے کسی حتمی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتے بلکہ ہزار برس کے اس تمدنی ورثہ کی دیکھ ریکھ میں بیشمار سخنوروں نے حصہ لیا ہے اور نہ ہے اسے شکست وریخت سے محفوظ رکھا صرف بلکہ اسکی آب و تاب کو قائم رکھتے ہوئے اپنے یہاں کی کاشی کاری، خاتم کاری اور مینا توری کے مانند اسے لازوال موضوعات سے مالا مال کیا ہے۔ چنانچہ علم، دانش، دین، داستان وروایات، اخلاق، علوم نقلی وعقلی، زندگی اور موت جیسے مسائل سے لیکر معاش، معیشت، معاد اور فنون لطیفہ کی روح، مصوری خطاطی، موسیقی اور اسی طرح ایران کی قدیم قومی روایات پہلوانی جیسے عنوانات پر بار بار اور طرح طرح سے اتنا لکھا ہے کہ فارسی شاعری ایران کی ساری تاریخ کو احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ عالمی اور آفاقی قدروں کی ترجمان بن گئی ہے

صغرا مہدی

اردو شاعری میں عورت کا تصور

ماہنامہ جامعہ، نئی دلی، جون ۱۹۸۳ ع
جلد ۸۰، شمارہ ۹، ص ۳۱ ـ ۴۴

اردو شاعری کی ابتداء غزل سے ہوئی جو خالص مردانہ طرز اظہار کی شاعری ہے۔ اس میں عورت کے حسن وجمال کا ذکر ہے۔ خواتین نے شاعری بھی کی تو مردوں کے ہی انداز بیان اور زبان میں۔ اس لئے اردو شاعری کی ساری امیجری عورت کی زلف ورخسار، قد وقامت اور ناز وادا سے عبارت ہے۔ البتہ دکنی شاعری میں عورت کے جذبوں کو زبان دی گئی ہے۔ ریختی ابتذال، ذکاکت اور فحاشی کی نذر ہو گئی

مرثیہ میں عورتوں کی فطرت کی عکاسی کی گئی ہے اسمیں کافی حد تک عورتوں کے فطری جذبات اور احساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔

مثنوی میں عورتوں کے کردار کو زیادہ تر محبوبہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

کہیں کہیں عاشق جانباز بھی نظر آتی ہے

۱۸۵۷ ع کے بعد شاعری کے موضوعات بدلے ۔ عورت کی آزادی اور اس سے متعلق مسائل بھی اٹھے عورت کی سیرت کے اچھے پہلو اور سماج میں اسکے رول کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا

ترقی پسند تحریک کے دور میں عورت کی محبوبہ والی حیثیت مسلم رہی ۔

اور آج ہندوستان میں جو شاعر خواتین شاعری کررہی ہیں وہ خالص عورتوں کے طرز احساس کی شاعری ہے ۔

کاظم علیخاں

توقیت غزلیات شرف

ماہنامہ شاعر ، بمبئی ، فروری ـ مارچ ۸۳ ع
جلد ۵۴ ، شمارہ ۲ ـ ۳ ، ص ۲۹ ـ ۳۶

خواجہ آتش کے صاحب دیوان شاگرد آغا حجو شرف لکھنوی اودھ کے اس شاہی خانوادے سے قرابت رکھتے تھے جو فروری ۱۸۵۶ ع میں اپنے اقتدار کا زمانہ گذار کر بے وطنی کے عالم میں ۱۳ مئی ۱۸۵۶ع سے کلکتـــہ میں جا بسا تھا ۔ شرف کے سنین ولادت ووفات کا صحیح علم نہیں ۔ البتہ انکے زمانے حیات کے متعلق اتنا اندازہ ضرور ہوتاہے کہ وہ ۱۸۲۸ع سے ۱۸۷۵ع تک ضرور بقید حیات تھے

مضمون ہذا میں مختلف قرائن وشواہد کی روشنی میں آغا حجو شرف کی ۶۰ غزلوں کے زمانہ تخلیق کی حد بندی کی سعی کی گئی ہے ۔

کلیم سہسرامی

بنگال کی ایک قدیم فارسی فرہنگ

ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ، مارچ ۱۹۸۳ ع
جلد ۱۳۱ ، شمارہ ۳ ، ص ۱۸۱ ـ ۲۰۲

یہ عجیب اتفاق ہے کہ لغت کی تدوین وتالیف شمالی ہند کے مرکز سے دور بنگال اور دکن میں بھی « شرفنامہ » اور « برہان قاطع » کی صورت میں ہوئی

چنانچہ «شرفنامہ» یا «فرہنگ ابراھیمی» کا شمار ایک اہم فرہنگ میں ہوتا ہے جو بنگال میں نویں صدی ہجری میں لکھی گئی ۔ یہ فرہنگ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اسکے قلمی نسخے مدرسہ عالیہ ڈھاکا کے علاوہ مدرسہ سپہ سالار عالی (تہران) برٹش میوزیم انڈیا آفس اور بوڈلین (لندن) کے کتبخانوں کی زینت سے ہوئے ہیں ۔ ایک نسخہ پٹنہ کی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں بھی آگیا ہے ۔

خاندان الیاس شاہی (۱۳۴۲ـ۱۴۹۴ ع)

کے بادشاہ ابو المظفر رکن الدین باربک شاہ (۱۳۵۹ ـ ۱۴۷۴ع) کے زمانے میں « شرفنامہ » کی تدوین ہوئی امکان ہے کہ اسکا مصنف سلطان مذکور کے دربار سے وابستہ رہا ہو مصنف کا نام ابراہیم اور اسکے والد کا نام « قوام » تھا اور وہ نسباً فاروقی تھا اسلئے اپنے آپ کو ابراھیم قوام فاروقی لکھتا ہے

« شرفنامہ » کے مختلف نام ہیں کسی نے اسے « شرفنامہ منیری » لکھا ہے کوئی « شرفنامہ ابراھیمی » کے نام سے یاد کرتا ہے کوئی فرہنگ ابراھیمی یا فرہنگ نامہ شیخ ابراھیم کہتا ہے . « شرفنامہ » فارسی کی لغت ایک کتاب ہے جسکے آغاز میں منظوم مقدمہ ، نعت اور مدح بھی شامل ہے الفاظ کی شرح سے پہلے حروف مفرد اور فارسی حروف تہجی سے بحث کی گئی ہے الفاظ کے معنی بیان کرنے کے سلسلے میں حافظ شیرازی سے فردوسی طوسی تک اور بعض جگہ خود مصنف نے اپنے اشعار سے استدلال کیا ہے . ہر فصل کے آخر میں بعض ترکی الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اور بعض جگہ فارسی الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے مصنف نے انکے مترادف ہندی (اردو) الفاظ بھی دیئے ہیں

گیان چند جین

دکنی کے لسانی رشتے

ماہنامہ سب رس ، حیدرآباد (ہند)
جنوری ـ فروری ۱۹۸۳ ع ،
جلد ۴۴ ، شمارہ ۱ ـ ۲ ، ص ۳ ـ ۲۰

ہند آریائی بولی ہونے کے سبب دکنی نے پنجابی ، ہریانی ، راجستھانی ، مراٹھی ، گجراتی اور برج سے استفادہ کیا ہے .

محمد حنیف

لسانی نظــریات

ماہنامہ المعارف لاہور ، مئی ۱۹۸۳ ع
جلد ۱۶ ، شمارہ ۵ ، ص ۳۱ ـ ۳۹

جدید علم لسانیات کا سائنسی اسلوب پر مطالعہ گذشتہ تین صدیوں سے شروع ہوا . لیکن اسے جدید دریافت نہیں کہہ سکتے

یونانی علماء کے ہاں فلسفیانہ بحث و نظر کا موضوع رہا ہے انکا بنیادی مقصد زبان کو بیرونی عناصر سے محفوظ رکھنا اور لغوی مداخلت کی راہیں بند کرکے زبان کی اصلیت کو برقرار رکھنا تھا تاکہ مذہبی تحریروں میں عدم اشتباہ زبان کی حفاظت کی ضمانت مہیا کرسکے

یہی نقطہ نظر اس زمانے میں ہندوؤں کے ہاں بھی کارفرما تھا . ہندی ادب

و لسانیات میں لسانی تحقیق و مطالعہ کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا اسکا محرک بھی یہی امر تھا کہ ویدوں کی زبان کو بیرونی مداخلت سے محفوظ رکھا جائے۔

زبان کے قوانین و قواعد کی فلسفیانہ بحث اور اس پر سختی سے پابندی کے عمل کی اصل بنیاد مذہبی عقیدہ ہے اور نظریہ زبان دراصل نظریۂ تقدسِ زبان ہے جسکا محور دینی کتب ہیں اس طرح عربی زبان کی تدوین کے اوائل عہد میں مسلمان ماہرین لسانیات نے بھی اسکو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا۔

الغرض مسلمان علمائے لسانیات نے عربی زبان کی پاکیزگی، اسکی اصل صورت اور فصاحت کو قائم و دائم رکھنے کیلئے جو قواعد و ضوابط وضع کیئے اور جس محنت سے مختلف علوم زبان ایجاد کئے اور جس شدت سے اس پر عمل پیرا رہے، دیگر ادیان کی دینی و الہامی کتب کی زبانوں کی حفاظت کے سلسلے میں کئے گئے اقدامات اسکے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

مظہر حنفی

اردو شاعری اور ہندوستانیت

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۸۳ء
جلد ۳۳، شمارہ ۱، ص ۲۳ - ۶۱

اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

امیر خسرو کے گیتوں، کہہ مکرنیوں، پہیلیوں، افضل جھنجھاوری کی بارہ ماسہ، قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے کلام میں ہندستانی عناصر بکثرت موجود ہیں۔

میر کی مثنویاں، شکار نامے، انشاء و سودا کے قصائد، نظیر اکبرآبادی کی نظمیں، انیس و دبیر کے مرثیے، واجد علی شاہ کے رہس، امانت کی اندر سبھا جان صاحب کی ریختی، محمد حسین آزاد کی نیچرل شاعری، حالی کی مسدس، اکبر، چکبست، اقبال، اختر شیرانی، جوش، احسان دانش، میرا جی، شاد عارفی اور فیض وغیرہ کے کلام میں ہندوستانی زندگی مختلف انداز سے جلوہ گر ہے۔

جدید نظم پر ہندستانی تشبیہات، تلمیحات اور مقامی ماحول کا گہرا اثر ہے۔

جدید تر غزل تو اپنی دھرتی سے بہت قریب آگئی ہے۔

رہی سہی کمی کا ازالہ نئی غزل سے ہوگیا۔ آج کی غزل میں ہندستانی اساطیر، تاریخی واقعات، دیہات کے مناظر، مقامی حالات، جغرافیائی اثرات سے لیکر موجودہ

ترقی پذیر مشینی نظام تک ہندستانی زندگی کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔

ماحول و معاشرے، تہذیب و تمدن، رسوم و قواعد، رہن سہن، توہمات و عقاید، زیورات و ملبوسات، دیو مالائی اثرات اور مقامات کی جو جھلکیاں ان شاعروں کے اشعار میں نظر آتی ہے انہیں پہلی نگاہ میں دیکھ کر ہی ہندستان سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔

نظام صدیقی

بشیر بدر کی غزلیہ شاعری کا وجودی اور جمالیاتی تناظر

ماہنامہ شاعر بمبئی، جلد ۵۴، شمارہ ۴، ۱۹۸۳ص ۱۱ - ۲۲

بشیر بدر کی غزلیہ شاعری محض آگہی انقطاع سے زیادہ گہرے وسیع تر انضمام بلکہ ارتفاع کی شاعری ہے۔ جو ہنگامی اور سیاسی نوعیت کے مقررہ حصار سے بلند ہوکر زندگی کی وحدت کو انکی تمام تر وسعتوں کے ساتھ دیکھنے، سمجھنے برتنے اور ہونے کا متمنی ہے۔ انکے یہاں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے بظاہر متضاد رویے ایکدوسرے کے زاویہ تکمیلہ ہیں اور بیاطن اپنے دور کے آرکسٹریائی ہم آہنگی کے زندہ اور بیدار حصہ ہیں۔

شخصیات

سید تقی رضا بلگرامی

علامہ میر سید محمد شاعر بلگرامی

ماہنامہ المعارف لاہور مارچ ۱۹۸۳ع
جلد ۱۶ شمارہ ۳، ص ۴۵-۴۹

علامہ میر سید محمد شاعر بلگرامی کی ولادت بعد نماز ظہر شنبہ کے روز ۱۴ ربیع الاول ۱۱۰۱ھ-۱۶۸۹ع کو بلگرام کے محلہ مدن پورہ میں ہوئی

شاعر بلگرامی کو عربی فارسی اور ہندی زبانوں پر عبور حاصل تھا تینوں زبانوں میں شعر کہنے کی قدرت بھی حاصل تھی آپ کا دیوان مرتب ہے۔ علامہ شاعر بلگرامی کا انتقال ۱۱۸۵ھ - ۱۷۷۱ع میں شب شنبہ ۸ شعبان کو بلگرام میں ہوا۔

کلیم سہرامی

ادیب الملک نواب نصیر حسن خیال کی آپ بیتی

ششماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۸۳ع، جلد ۳۳ شمارہ ۱ ص۱-۶

صاحب مضمون دراصل اس مضمون کے ذریعہ طلباء اور اساتذہ اردو کی توجہ

معطلب کرانا چاہتے ہیں تاکہ نواب نصیر حسن خیال پر کچھ ٹھوس کام ہوسکے جنکی تحریر میں شعریت، لطافت اور رنگینی کے ساتھ ساتھ حسن خیال اور لطف زبان بھی پایا جاتا ہے۔

محمد صلاح الدین عمری

قاضی ارتضاد علی خان خوشنود ایک جائزہ

ماہنامہ برہان دہلی، جولائی ۱۹۸۳ع
جلد ۹۱ شمارہ ۱، ص ۵۱-۶۰

خطہ اودھ کے ایک قدیم قصبہ گوپامئو قاضی ارتضا علی خان کی ولادت ۱۷۸۳ع میں ہوئی۔

گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ علوم دینیہ کے ایک ممتاز عالم ہونے کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم پر بھی نگاہ تھی۔ آپ صاحب طرز ادیب اور اچھے فارسی عربی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ۱۲۳۰ھ میں نواب عظیم الدولہ نے لیاقت واستعداد کا شہرہ سنکر فتویٰ نویسی کی خدمت آپکے سپرد کی حکومت انگلیشیہ نے مقام چتوڑ میں قاضی القضاۃ کے عہدہ سے سرفراز کیا تصنیف وتالیف درس وتدریس ر مطالعہ کتب آپکا محبوب مشغلہ تھا، بی وفارسی میں آپ کی تصانیف کی تعداد بیس ہیں۔ ہندی میں بھی شاعری کی ہے جب آپ حج سے واپس ہورہے تھے تو جہاز ہی میں عدن و جدہ کے درمیان ۷ شعبان ۱۲۷۰ھ بروز جمعہ آپ کا انتقال ہوا

متفرقات

اشفاق انجم

مالیگاؤں کی پہلی کتاب
«گلشن ابراھیم خلیل»

پندرہ روزہ قومی راج بمبئی مئی ۱۹۸۳
جلد ۱۰، شمارہ ۹ ص ۱۸ - ۲۱

صاحب مضمون نے اپنی تحقیق کے ذریعے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مالیگاؤں کی اولین کتاب یا گلدستہ «گلشن ابراھیم خلیل» ہے جو مئی ۱۹۸۱ع (غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ مئی ۱۹۱۱ع ہونا چاہئے) میں مطبع مصطفائی بمبئی میں طبع ہوکر شائع ہوئی جسے مولوی عبدالمجید وحید صاحب نے تالیف کیا۔ اسکے علاوہ عبدالمجید وحید صاحب کی دیگر تالیفات کا بھی تعارف کرایا ہے جنکے نام حسب ذیل ہیں ۱) مکاتیب دالنسا (اول ودوم) ۲) تحفہ عید عرف چراغ نماز ۳) مجید غفار قول مختار در مانت مسجد فرار

۴) باغ عروس، افتخار مجید
۵) سبحۂ بابرکات عرف مجربات مجید
۶) مقالۂ شرعیہ عرف فتاویٰ مجیدیہ
۷) تاریخ شہر مالیگاؤں عرف فروغ مجیدیہ
۸) مصابیح شرعیہ عرف مجموعۂ فتاوی وحیدیہ
۹) ترشحات وحید ۱۰) مباحات وحید

رہبر قریشی

کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ
احمد آباد کے چند اردو مخطوطات

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۸۳ء
جلد ۳۳، شمارہ ۱، ص ۷-۲۲

دو تین سو سال پرانے یہ مخطوطات گجرات کے ان شہروں میں تالیف و کتابت کئے گئے ہیں جو اسوقت علم و ثقافت کا مرکز خیال کئے جاتے تھے۔ بعض کا تعلق گرد و نواح کے صوبوں سے ہے گو یہ سب اردو رسم الخط میں ہیں تاہم مصنفین نے گجری ہندی یا دکھنی سے تعبیر کیا ہے۔ انکی فقہی اہمیت تو ہے ہی مگر ساتھ یہ گجرات میں اردو کے ارتقاء کا ایک مرحلہ بھی ہے۔ اس وقت کے املا کا طریقہ، لب و لہجہ اور مقامی زبانوں کے اردو کے سیر تکامل میں حصے کا ان سے پتہ چلتا ہے اس ضمن میں مندرجہ ذیل مخطوطات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱) فقہ ہندی (مثنوی) از عبدالکریم بن اشرف انصاری
۲) منظوم کتاب فقہ۔ نام کتاب و مصنیف نہیں
۳) فقہ المبین از یقین
۴) مختصر المسائل۔ از عبدالکریم
۵) فقہ آسان یا فقہ ہندی از عرفان

سید معین الرحمن

پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے بیتیس سال — رفتار اور معیار
۱۹۴۷ء – ۱۹۸۲ء

ماہنامہ اخبار اردو کراچی اپریل ۱۹۸۳ء
جلد ۳، شمارہ ۳، ص ۱۳-۲۸

پاکستان کے مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق میں جو کچھ کام ہوا ہے اسکی مکمل فہرست ہے اس ضمن میں مندرجہ ذیل یونیورسٹیوں میں جو مقالہ لکھے گئے ہیں انکی تفاصیل دی گئی ہے۔

۱) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲) ڈھاکا " (۱۹۴۸-۱۹۷۱ء)
۳) سندھ " حیدرآباد۔جامشورو
۴) کراچی یونیورسٹی
۵) پشاور "
۶) بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان
۷) اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور
۸) جامعہ بلوچستان کوئٹہ

عبداللہ دریاہ

مترجم رحمت فرح آبادی

سندھ میں سمہ دور کے سکے

اور انکی تاریخی اہمیت

ماہنامہ المعارف لاہور مئی ۱۹۸۳ ع

جلد ۱۶، شمارہ ۵، ص ۱۳ - ۳۰

عربوں کے زوال کے بعد سندھ کی حکومت یہاںکے مقامی باشندوں یعنی سومرہ خاندان کے ہاتھوں آئی. سومرہ خاندان کے زوال کے بعد سندھ پر سمہ خاندان کا اقتدار قائم ہوا یہ دراصل چندروںسی راجپوت تھے جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے. انکا لقب جام تھا انکا تقریباً پونے دو سو سال یعنی ۷۵۱ھ - ۱۳۵۰ع سے ۹۲۳ھ (۱۵۱۹ع) تک حکمراں رہا کبھی خود مختار رہے اور کبھی سلاطین دہلی کے زیر سایہ

اگرچہ کئی حکمراں خود مختار تھے لیکن انھوں نے سکہ جاری کرنے کی طرف دھیان نہ دیا.

یہ سکے سونے چاندی اور تانبے کے ہوا کرتے تھے.

قمر عمار

تاریخ جہانگشای جوینی

ماہنامہ جامعہ نئی دلی مارچ ۱۹۸۳ ع

جلد ۸۰ شمارہ ۳، ص ۲۱ - ۲۹

تاریخ جہانگشای جوینی (۱۲۶۰ع - ۶۵۸ھ) ایران کے تاریخی آثار میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے اسکا مولف خواجہ عطا ملک علاء الدین بن بہاء الدین محمد بن شمش الدین محمد جوینی (ولادت ۱۲۲۶ع - ۶۲۳ھ) جس نے یہ کتاب ۶۵۸ھ کے قریب مکمل کی اپنے زمانے کی علمی اور سیاسی شخصیتوں میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا

اسکی یہ عظیم الشان کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اسکی عبارتوں میں زمانے کے رواج کے مطابق نہ صرف عربی الفاظ و جملے کثرت سے نظر آتے ہیں بلکہ جگہ جگہ معمولی زبان کے الفاظ بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہے.

گوپی چند نارنگ

سفر آشنا

ماہنامہ شبخون الہ آباد، فروری - اپریل ۱۹۸۳ع، جلد ۱۷، شمارہ ۲۸، ص ۵-۲۸

گوپی چند نارنگ نے دلچسپ انداز میں اپنے احساسات و لمحات سفر جو امریکہ، کینیڈا اور لندن کو قلمبند کیا ہے.

* * * *

مقالہ نما ذیل کے رسائل سے ترتیب دیا گیا ہے

المعارف — ماہ نامہ
(مدیر محمد سعید شیخ)
ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

الفرقان — ماہ نامہ
(مدیر: محمد منظور نعمانی)
۳۱، نیا گاؤں (مغربی) لکھنؤ

معارف — ماہ نامہ
(مدیر: صلاح الدین عبدالرحمن)
دارالمصنفین، اعظم گڑھ (یو پی)

برہان — ماہ نامہ
(مدیر: سعید احمد اکبرآبادی)
اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

سب رس — ماہ نامہ
(مدیر: مغنی تبسم)
ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو
حیدرآباد (آندھرا)

شاعر — ماہ نامہ
(مدیر افتخار امام صدیقی)
مکتبہ قصر الادب، بمبئی ۸

کتاب نما — ماہ نامہ
(مدیر شاہد علی خاں)
مکتبہ جامعہ اسلامیہ، جامعہ نگر، دہلی ۲۵

جامعہ — ماہ نامہ
(مدیر: ضیاء الحسن فاروقی)
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

نوائے ادب — ششماہی
(مدیر: نظام الدین ایس گوریکر)
انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱

شب خون — ماہ نامہ
(مدیرہ: عقیلہ شاہین)
۳۱۳، رانی منڈی، الہ آباد

●

رسائل کے مدیروں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنے رسائل و جرائد نوائے ادب میں مقالہ نما کی ترتیب کے لئے ڈائرکٹر کے نام بھیجیں۔ (مدیر)

Edited by Dr Nizamuddin S Gorekar
Director, Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute, Bombay 400 001
Published by Mr Abdul Majeed Patka
General Secretary Anjuman-i-Islam, Bombay 400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay 400 008

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

- لمعات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنمائے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی

- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- غزل ولی تک (مولفہ)
- اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

- اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
- نوائے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
- طوطیان ہند (مرتبہ)
- انڈو ایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)

عبدالرزاق قریشی

- نوائے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- راگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے (مصنفہ) ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی (مرتبہ) ڈاکٹر حامداللہ ندوی

مقالہ نما (مرتبہ) رفیعہ اسامدار

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب، بمبئی

Registration No 32009/50

رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نوعیت اشاعت : ششماہی

نام پرنٹر : جناب عبدالمجید پالکا، بی، کام (آنرز)

قومیت : ہندوستانی

پتہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پبلشر
قومیت
پتہ
} ایضاً

نام ایڈیٹر : پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

قومیت : ہندوستانی

پتہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پتہ مالک رسالہ : ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید ای پالکا

● ● ●

All remittances & correspondence be made to
Prof N S Gorekar, M A, Ph D, D. Litt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

●

Annual Subscription

Inland : Rs 15 00 ● Foreign . Pound 4

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے فروری ۱۹۴۷ع میں الحاق ہوا)

اغراض و مقاصد

۱ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا انتظام کرنا
۲ اور دوسرے تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
۶ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ اردو کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

نوائے ادب بمبئی

(۱۹۵۰ع)

(ہر سال دو بار اپریل اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

خصوصیات

۱ اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر تبصرے

(سالانہ چندہ ۱۵ روپیے)

•

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ڈائرکٹر
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ ، دادا بھائی نورو جی روڈ ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

REGISTRATION NO. : 32009/50

NAWA-E-ADAB

(BIANNUAL)

VOLUME : XXXIII
OCTOBER
1983

ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001